

مرے خدا
مرے دل

دل نے ایک ایک دکھ سہا تنہا
انجمن انجمن رہا تنہا

مرے خدا
مرے دل

مجید امجد کی شاعری

مرتب

تاج سعید

بسلسلۂ قند

مجید امجد نمبر

جولائی ۱۹۷۵ء

ناشر: آذر سعید
مکتبۂ ارژنگ، ظہیر آباد
چارسدہ روڈ، پشاور

مطبع: شاہین پرنٹنگ پریس پشاور

خطاطی: خادم حسین کشش

قیمت: روپے

مجلد روپے

ملنے کا پتہ:-

آئینہ ادب، چوک مینار، انار کلی لاہور
ہارون اینڈ کو — سینما روڈ، پشاور

مجید امجد

کے

باوفا ملازم

علی محمّد

کے نام

پلٹ پڑا ہوں شعاعوں کے چیتھڑے اوڑھے
نشیبِ زینۂ ایام پر عصا رکھتا

ترتیب

	حرف اول	تاج سعید	۱۲
	پیش لفظ	خاطر غزنوی	۱۵
	خود نوشت	مجید امجد	۲۵
	عکس تحریر	مجید امجد	۲۶
۱	نہ کوئی سلطنتِ غم ہے نہ اقلیمِ طرب		۲۷
۲	مرے خدا مرے دل		۴۰
۳	مشرق و مغرب		۴۵
۴	اور اب یہ کہتا ہوں، یہ جرم تو روا رکھتا (غزل)		۴۸
۵	پیش رو		۵۰
۶	ساملی		۵۱
۷	میونخ		۵۴
۸	دنیا سب کچھ تیرا		۵۷
۹	جو دن کبھی نہیں بیتا وہ دن کب آئے گا (غزل)		۵۹
۱۰	مشاہیر		۶۰
۱۱	لاہور		۶۲
۱۲	کبھی تو سوچ ترے سامنے نہیں گزرے (غزل)		۶۸

۱۳	صدا بھی مرگِ صدا	۶۹
۱۴	کیا یہ سمر کو خبر ہے!	۷۱
۱۵	قاصد مست گام، موجِ صبا (غزل)	۷۳
۱۶	ریلوے اسٹیشن	۷۴
۱۷	توسیعِ شہر	۷۶
۱۸	زینیا	۷۷
۱۹	میری مانند خود نگر تنہا (غزل)	۷۹
۲۰	بہار	۸۰
۲۱	سپاہی	۸۱
۲۲	مسیحا	۸۲
۲۳	دامنِ دل	۸۳
۲۴	کیا کہئے، کیا حجاب وحیا کا فسانہ تھا (غزل)	۸۴
۲۵	افسانے	۸۵
۲۶	دل کا پتھر	۸۶
۲۷	رکھیاں اکھیاں	۸۷
۲۸	یہ سبز پیڑوں کے سائے	۸۹
۲۹	جاوداں قدروں کی گتھی اور الجھی، جل اٹھی تقدیرِ دل (غزل)	۹۱
۳۰	بے نشاں	۹۲
۳۱	ایک شبیہہ	۹۴
۳۲	دوام	۹۷
۳۳	دیکھ اے دل	۹۸

۳۴	برس گیا بہ خرابات آرزو ترا غم (غزل)	۹۹
۳۵	بارکش	۱۰۰
۳۶	موانست	۱۰۱
۳۷	ثمر خوں	۱۰۲
۳۸	جب اک چراغ راہ گذر کی کرن پڑے (غزل)	۱۰۳
۳۹	ایک شام	۱۰۴
۴۰	نیلم جڑے پیالوں میں	۱۰۵
۴۱	بہار کی چڑیا	۱۰۷
۴۲	پھولوں کی پلٹن	۱۰۹
۴۳	جو ہو سکے تو مرے دل، اب اک یہ قصّہ کبھی (غزل)	۱۱۱
۴۴	برہنہ	۱۱۲
۴۵	سونے والو	۱۱۴
۴۶	ہوٹل میں	۱۱۶
۴۷	گہرے سروں میں عرضِ نوائے حیات کر (غزل)	۱۱۷
۴۸	وطن	۱۱۸
۴۹	جیون دیس	۱۱۹
۵۰	ایکٹریس کا کنٹریکٹ	۱۲۱
۵۱	ایک فلم دیکھ کر	۱۲۲
۵۲	اب یہ مسافت کیسے طے ہو اے دل تو ہی بتا (غزل)	۱۲۴
۵۳	گہرے بھیدوں والے	۱۲۵
۵۴	ہوس	۱۲۶

۵۵	جو دل نے کہدی ہے یہ بات اُن کہی بھی نہ تھی (غزل)	۱۲۸
۵۶	بھکارن	۱۲۹
۵۷	اُس خود موج سمندر میں	۱۳۰
۵۸	جلسہ	۱۳۱
۵۹	روئے عالم تھا جس کی جولاں گہ (غزل)	۱۳۳
۶۰	حرص	۱۳۴
۶۱	تیری خاطر	۱۳۶
۶۲	لمبی دھوپ کے ڈھلنے پر......	۱۳۷
۶۳	ان گنت امروں اور کیا ہے ترے دل کے لئے (غزل)	۱۳۹
۶۴	دل کا چھالا	۱۴۱
۶۵	دل کے گاؤں میں	۱۴۲
۶۶	او گنہار ولا	۱۴۳
۶۷	سفر کی موج میں تھے، وقت کے غبار میں تھے (غزل)	۱۴۵
۶۸	ریڈیو پر اِک قیدی......	۱۴۶
۶۹	صاحب کا فروٹ فارم	۱۴۷
۷۰	چہروں کی اُستلیں	۱۴۸
۷۱	جویا	۱۴۹
۷۲	یہ سب دن	۱۵۰
۷۳	سنا ہے میں نے کہ شعری تمہاری سمت سفر (غزل)	۱۵۲
۷۴	گوشۂ دامن	۱۵۳
۷۵	باگیں موڑ بھی لے	۱۵۴

۷۶	آج تو جاتے جاتے	۱۵۵
۷۷	دن کٹ رہے ہیں کشمکش روزگار میں (غزل)	۱۵۶
۷۸	دریا، نیلی آنکھوں کا	۱۵۷
۷۹	گدلے پانی	۱۵۸
۸۰	ہے جوزہر ہی وجہِ شفا جو تو چاہے (غزل)	۱۵۹
۸۱	ہر وقت مگر مرگِ غریبانہ چاہیئے (غزل)	۱۶۰

حرفِ اوّل

ہم سب جانتے ہیں کہ مجید امجد نے اپنی ساری زندگی تنہائی کا کرب سہتے ہوئے گزاری ہے اور اس تنہائی کے بطن سے اس نے جو جواہر پارے چنے ہیں وہ اردو شاعری کا ایک ایسا لازوال سرمایہ ہیں جن کی قدروقیمت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی جائے گی۔ اگر مجید امجد چاہتے تو وہ اپنی زندگی پُرمسرت بھی بنا سکتے تھے، لیکن اگر وہ ایسا کرتے تو پھر ہم ان کی بے پناہ فکری صلاحیتوں کی جھلک کس طرح دیکھ پاتے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں ہمیں ان کے شعری سرمائے کی بے بہا دولت سے محروم ہونا پڑتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ قدرت کی طرف سے ان کو جو تخلیقی ذہن رسا ملا تھا، انہوں نے اس سے پوری طرح فائدہ اٹھایا اور ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ کئے بغیر بڑی لگن سے اپنے تخلیقی کام میں مگن رہے۔

ان کی زندگی میں ان کے فن پر وحید قریشی، مظفر علی سیّد وزیر آغا اور محمد حسن نے قلم اٹھایا۔ یہ مضامین ان کے اس سرمایۂ فن کے مقابلے میں بہت کم تھے جو انہوں نے اس دوران میں تخلیق کیا تھا۔ یعنی وہ جس پذیرائی کے مستحق تھے وہ انہیں اپنی زندگی میں نہ ملی،

اس لئے کہ وہ ہنگامہ پسند نہ تھے، ادبی سودا بازی اور ریاکاری ان میں نام کو بھی نہیں تھی، یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے حجرۂ تاریک میں گوشہ گیر رہے۔ ان حالات میں بھی مجید امجد کے فن کی روشنی بڑی تابناک تھی اس کی شاعری کے قدردانوں کی تعداد اگر زیادہ نہیں تھی تو بہت کم بھی نہیں تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس لحاظ سے وہ خوش قسمت تھے کہ ان کو سخن شناسوں کا باشعور حلقہ ملا اور وہ ایسے مہربانوں کے ہتھے نہ چڑھے جن کی تعریف بے جا ان کے فن کو ماند کرنے کا سبب بنتی۔

ان کی وفات کے فوراً بعد ان کے مداحین کا ایک وسیع حلقہ پیدا ہو گیا ہے، جن میں سے بیشتر نے انہیں اپنے قبیلے اور حلقۂ اثر کے تابع بنانے کی سعی کی ہے، جو اس درویش صفت شاعر کی اس ریاضت اور انا کے منافی ہے جس کے تحت وہ ساری عمر ایسے ہنگاموں سے دور رہا۔ حالانکہ متذکرہ حلقوں میں شامل ہونے والے اس سے کم درجہ کے شاعر بھی آج قطب بنے پھرتے ہیں۔

اب جبکہ مجید امجد ہم میں موجود نہیں ہیں۔ ان کا شعری سرمایہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا حقیقی ترجمان ہے اور اس کو سامنے رکھ کر ان کی ذہنی اور فکری استعداد کا جائزہ لینا چاہیئے۔ انہوں نے جدید نظم کو جو شکوہ عطا ہے یہ انہی کا حصہ ہے اور ان کی فکری پرواز اور شوکت الفاظ کا آوازہ ایک مدت تک ایوانِ نظم میں گونجتا رہے گا بلکہ اس کی روشنی آنے والے شعراء کو نئے راستے بھی دکھائے گی۔

قابلِ افسوس امر یہ ہے کہ سال بھر کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی مجید امجد کی تخلیقات کو منظرِ عام پر نہیں لایا گیا۔ حالانکہ سابق

وزیرِ اعلیٰ پنجاب ۔ اس کام کی انجام دہی کے لئے ادباء کی ایک کمیٹی بھی تشکیل دی گئی لیکن یہ کمیٹی جناب محمد حنیف رامے کی مصروفیات کی وجہ سے اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام نہیں دے سکی۔

مجید امجد کی پہلی برسی کے موقع پر قند کا "مجید امجد نمبر" اس عظیم شاعر کی خدمت میں بہترین ہدیۂ خلوص ہے، جسے ادبی حلقوں میں کافی سراہا گیا ہے اور مجید امجد کی برسی کے سلسلے میں ہونے والے تعزیتی جلسوں میں اسے خوب خوب داد ملی ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ قند کے مجید امجد نمبر کو تکمیل بخشنے کا ایک اور ذریعہ ہے۔ اسے مرتب کرنے کا مقصد نہ صرف مجید امجد کی ان منظومات کو محفوظ کرنا ہے، جو رسائل کے اوراق میں بکھری پڑی ہیں بلکہ یہ مجموعۂ کلام قند کے مجید امجد نمبر کی دوسری کڑی کے طور پر ایک دستاویز کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ توقع ہے مجید امجد کے کلام کا یہ انتخاب ان کے قدر دانوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

—— تاج سعید

پیش لفظ

ادب کے ایک عام قاری کی حیثیت سے مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اردو شاعری ہر زمانے میں ایک زندہ اور رواں دواں ایک بامعنی اور بامراد صنفِ ادب رہی ہے، اس کا ہر دور گنے کی پوروں کی طرح ایک دوسرے سے جدا لیکن منسلک اور یوں رسیلا اور جاندار ہے اردو شاعری کے سفر کی ابتدا سے آج تک کی مسافت کا جائزہ لیا جائے تو منزل بہ منزل یہ پودا پھولتا پھلتا نظر آتا ہے، موسموں کے دائروں کی طرح ہر رنگ اپنے حسن کی منفرد بہار کا حامل ہے۔

ہر دور میں آگے بڑھنے اور خوب سے خوب تر کی تلاش کا جذبہ اور امنگ موجود ہے، مشاہدات کی بوقلمونی اور تجربات کی فراوانی جذب کرنے کی صلاحیت اور اظہار کی قوت ملتی ہے، ہر زمانے میں ایسے اہلِ قلم نظر آتے ہیں جو شعر کو نیا شعور، نئی وسعتیں، نیا آہنگ اور نیا لہجہ دینے کے لئے ہر طرح کے طوفانوں کا مقابلہ کرتے رہے ہیں۔

اردو شاعری کی دنیا میں ہمیشہ نئی تحریکوں کے علم بھی فضا میں لہرائے، مخالفتوں کی آندھیاں بھی چلیں معرکے بھی ہوئے لیکن اگلے ہر دور نے ثابت کر دیا کہ پچھلی تحریکوں نے اگلی نسلوں کے لئے نئے تجربوں کے پھول بوئے، جن کی خوشبوؤں اور رنگوں نے اکثر طویل عرصوں کے

کے فضاؤں کو دلکشی بخشی، لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ یہ شادا بیاں محض تحریکوں تک ہی محدود نہیں بعض ایسے اہل قلم بھی پیدا ہوئے جو اپنی ذات میں ایک مکتب اور ایک تحریک کی قوت رکھتے تھے. ان کے سامنے ماضی کی واضح تصویر تھی حال کا شعور و ایقان اور مستقبل کا عرفان تھا، ایسی دلو قامت شخصیتوں کی اردو شعر و ادب میں کمی نہیں البتہ ان کے تخلیقی طریقِ کار میں فرق ضرور پایا جاتا ہے اور یہی انفرادیت کا طرۂ امتیاز ہے، امیر خسرو، قلی قطب شاہ، ولی، حاتم، میر و میرزا، آتش و ناسخ، میر حسن و میرزا شوق، نسیم و نظیر، انیس و دبیر، غالب و مومن، داغ و امیر، شبلی و حالی، اقبال، حسرت، اور آج کے دور میں جوش، فیض، ندیم، مجاز، ساحر، راشد اور پھر جدید دور کے نئے نظم نگاروں میں مجید امجد ایک نئے ذہن اور نئے لہجے کے سبب سے جدا اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔

مجید امجد کا دور وہ دور ہے جبکہ رومانیت، ترقی پسندی اور جدیدیت کی تحریکوں کو کشمکش کے غبار میں دھندلاہٹوں کا شکار ہونا پڑا لیکن مجید امجد اس کشمکش کی دھند سے الگ تھلگ تنہائیوں کی خاموش اور جامد فضا میں زندہ تجربوں کے پیغام رساں کبوتر اڑاتا رہا۔ آج مجید امجد ہم میں نہیں ہے لیکن اس کے چھوڑے ہوئے کبوتر ادب و شعر کے ایوانوں کی ممٹیوں پر بیٹھ رہے ہیں اور مجید امجد کے شعری پیغامات ادب کے در و بام میں زندگی کی نئی سمتوں کی نشاندہی کر رہے ہیں۔

"شبِ رفتہ" کی اشاعت پر اس نئی آواز کا رسیلا پن سب نے محسوس کیا تھا لیکن اس وقت بھی ادب کی دنیا کے بعض امراء

(ARISTOCRATES) کے ایوان ہل گئے تھے اور یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ ان بتوں نے اپنے مخصوص حربے استعمال بھی کئے۔ اس بات کا عرفان مجید امجد کو پہلے سے تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ "شبِ رفتہ" کے شروع میں جو بغیر عنوان کے یہ آٹھ مصرعے شامل کئے گئے تھے تو شاید یہ دنیا کے اسی رویّے کا ردِ عمل تھا جو بعد میں اس کی زندگی کا منشور بن گیا اور جس پر وہ تادمِ مرگ عمل پیرا رہا۔

ہاں — اسی گم سم اندھیرے میں ابھی
بیٹھ کر وہ راکھ چھننی ہے ہمیں
راکھ۔ ان دنیاؤں کی جو جل بجھیں
راکھ جس میں لاکھ خونیں شبنمیں
زیست کی پلکوں سے ٹپ ٹپ پھوٹتی
جانے کب سے جذب ہوتی آئی ہیں
کتنی روحیں ان زمانوں کا خمیر
اپنے اشکوں میں سموتی آئی ہیں

گم سم اندھیروں میں بیٹھ کر وہ جلتی بجھی دنیا کی راکھ سے چنگاریاں چنتا رہا اور اندھیروں میں تجربوں کے چراغ جلاتا رہا۔

اس نے اپنے پہلے مجموعہ کلام کا نام "شبِ رفتہ" تجویز کیا تھا، گویا رات گزر گئی پر اندھیرے برقرار رہے رات کے اندھیروں میں تو جگنو کی ٹمٹماہٹ سے بھی راستے تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن دن کے اندھیروں کو پاٹا جا سکتا ہے۔ یہی مجید امجد کی الجھن تھی۔ یہی کھٹک اس کے لئے غمِ منزل بن گئی تھی۔ اس جذبے کا اظہار اس

کی بعد کی کئی نظموں میں ملتا ہے "یہ سبز پیڑوں کے سائے" "اس خود موج سمندر میں" "میرے دل کے گاؤں میں" "دنیا سب کچھ تیرا" "چہروں کی اقلیمیں" "باگیں موڑ بھی لے" "کوڑھی او گنہار ولا" "بے نشان" "دریا پہیلی آنکھوں کا" میں انہی جذبات کا اندوہناک اظہار ہے۔

یہاں یہ بحث طلب مسئلہ چھڑ سکتا ہے کہ مجید امجد کے ہاں قنوطیت کا عقاب اپنے پر پھیلائے اس کی وسیع دنیا پر سائے برسا رہا ہے — لیکن اس مسئلے کو امجد کی وہ نظم سلجھا کر رکھ دیتی ہے جس میں وہ اپنے من کو مارنے کا جواز کچھ ایسے روشن انداز میں پیش کرتا ہے کہ قنوطیت پسندی کے اعتراضات کے سائے اس روشنی میں اپنا وجود گم ہوتا محسوس کرتے ہیں۔

"دامنِ دل" نو چھوٹے چھوٹے مصرعوں کی ایک مختصر سی نظم ہے اور ایک طرف یہ شاعر کے منشور کی پیروی کا فریضہ ادا کرتی ہے تو دوسری طرف زخم کھا کر مسکرا دینے اور یوں رجائیت پسندی کی ریت کو بھی پورا کرتی ہے۔

سدا رہے یہ دھلا دھلا ستھرا ستھرا
زندہ
اپنے وجود کی اصلیت سے منوّر
اس پر میل نہ رہنے پائے
اس کو گھٹہ دے
اس کو توڑ مروڑ دے، کس دے
اس کو جھٹک دے

اس کی گیلی شکنیں چُن دے
اس کو سچے سُکھ میں سُکھا

مجید امجد نے مختصر ہی نہیں طویل نظمیں بھی لکھی ہیں جن میں
نہ کوئی سلطنتِ غم ہے نہ اقلیمِ طرب

سب سے طویل ہے، اس نظم کا انداز غنائیے کا ہے اور اس میں بھی شاعر کے غم کی ایک طولانی کہانی ہے اس نظم میں مختلف دیو مالائی کواکب کے گیت ایک طرف تو غم کے مختلف نقطہ ہائے نظر کو ترنم غنائیت اور فلسفے کی آمیزش سے دلکش بنا دیتے ہیں اور دوسری طرف مجید امجد کے آدرش کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

بات مختصر یا طویل نظم کی نہیں، یہ تو ابلاغ کے انداز ہیں اصل چیز مجید امجد کی زندگی پر چھایا ہوا ازلی غم ہے، اس کے دل میں چبھا ہوا خار ہے جس کی تفسیر وہ رنگوں، موسموں، پانیوں، ہواؤں، آسمانوں، صحراؤں، پہاڑوں، میدانوں، باغوں، پیڑوں، شہروں، دیہاتوں، گلیوں، بازاروں، چہروں، جسموں، آنکھوں، ہونٹوں اور دلوں کے حوالے سے کرتا ہے۔

دراصل مجید امجد کی شاعری دوسرے شاعروں کی طرح غیر مربوط بکھری ہوئی یا آزاد نہیں ہے وہ تو ایک آدرش، ایک منشور کے تحت قلم کو کاغذ کا وصل بخشتا رہا۔ اُن کی ہر نظم، اور غزل کا ہر شعر تسبیح کے رنگ رنگ دانوں کی حیثیت رکھتا ہے جو ایک دھاگے میں پرو دیئے گئے ہیں اور اس پر جو وظیفہ پڑھا جاتا ہے وہ ہے — غم، غم، غم، غم —— غم جو ساری دنیا اور دنیا کی ہر شے کا مقدر ہے لیکن جس

سے آنکھیں ملانے کا حوصلہ بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔

مجید امجد غم کی بھٹی میں تپ کر کندن بنا ہے، اب یہ اس کے نقادوں کا منصب ہے کہ مجید امجد کے غم کو میرؔ، غالبؔ اور فانیؔ کے غم سے کس طرح ممیز کرتے ہیں۔

"مرے خدا مرے دل" شبِ رفتہ کے درویش خالق کی سولہ سالہ تپسیا کا ثمر ہے جس میں اس سچے فنکار کی بامعنی انفرادیت، وسیع تجربہ، قدرتِ کلام اور ذہنی ارتقاء واضح طور پر اس کی شخصیت کو ابھار کر سامنے لاتے ہیں۔

مجید امجد کے فاضل نقادوں نے اس کی انفرادیت کو اپنے اپنے انداز میں اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے' اسے "فسردگیٔ مجسم" "تنہائی کا مسافر" اداس لمحوں، اداس شاموں کا شاعر" "تخلیقِ سفر میں ایک تنہا مسافر" "تارک الدنیا" "خرقہ پوش، پابگل شاعر" وغیرہ کہا ہے' ان سب کی تحریروں میں تنہائی، اداسی اور درویشی ایک مشترک قدر کی حیثیت سے مجید امجد کی شخصیت کو ابھارتی ہے۔ لیکن ایک نقاد اسے "کھلی آنکھوں والا شاعر" کہہ کر بظاہر متذکرہ پہلوؤں سے انحراف کرتا ہے' لیکن دراصل یہ بات یوں نہیں' روشنی میں تو آنکھیں چندھیا کر بند ہو جاتی ہیں۔ اندھیروں میں آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ تاریکی میں بکھری ہوئی اشیاء کو دیکھنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے شاید اسی لئے مجید امجد نے اپنے شعری منشور میں گم سم اندھیروں کی وادی کو اپنا مسکن بنانے کا اعلان کیا کہ اندھیروں میں راکھ سے چنگاریاں روشنیوں کی بہ نسبت زیادہ آسانی سے چنی جا سکتی ہیں۔ سورج کی نشاندہی کیا مشکل ہے، بات تو

جب ہے کہ جلی بجھی دنیا کی راکھ سے زلیست کی پلکوں سے پھوٹتی خونیں شبنمیں چنی ہیں یہی مجید امجد کے فن کی امتیازی خصوصیت ہے اور شبِ رفتہ کے بعد اس کے اس دوسرے مجموعۂ کلام میں زیادہ توانائی، زیادہ قوت، زیادہ گہرائی اور گہرائی اور زیادہ بلند آہنگی کی حامل ہے. شاید اسی توانائی اور گہرائی کا سبب ہے کہ جدید شاعروں نے مجید امجد کی شاعری کو دل سے لگالیا ہے اور مجید امجد کو اپنے پیش رو کی حیثیت سے تسلیم کر لیا ہے.

مجید امجد کے ہئیتی تجربات ہوں یا ذہنی، زبان کی تراش خراش ہو یا لہجے کی انفرادیت —— وہ ایک طرف تو جدید ذہنوں کے لئے قبلہ نما ہے اور دوسری طرف شیشے کے ایوانوں میں بیٹھ کر گالی دینے والے ARISTOCRATES کے لئے گوپھن کا پتھر۔

مجید امجد نے نظم کے مقابلے میں بہت کم غزلیں لکھیں، لیکن اس کی غزل بے ساختہ پن، تازگی، تاثیر، تغزل اور گہرائی کی حامل ہے، زیرِ نظر مجموعہ میں شامل اس کی چند غزلوں کے یہ اشعار بڑے بڑے ضخیم دیوانوں پر بھاری ہیں اور حیاتِ جاوید حاصل کرنے کا حق رکھتے ہیں.

میں روز ادھر سے گزرتا ہوں کون دیکھتا ہے
میں جب ادھر سے نہ گزروں گا، کون دیکھے گا

یہ آنکھیں ہنستی وفائیں، یہ پلکیں جھکتے خلوص
کچھ اس سے بڑھ کے کسی نے کسی کو سمجھا بھی.

اس جھلتی دھوپ میں یہ گھنے سایہ دار پیڑ
میں اپنی زندگی انہیں دیدوں، جو بن پڑے

امجد طریقِ مے میں ہے یہ احتیاط شرط
اک داغ بھی کہیں نہ سرِ پیرہن پڑے

میں ایک پل کے رنجِ فراواں میں کھو گیا
مرجھا گئے زمانے مرے انتظار میں

میری مانند، خود نگر، تنہا
یہ صراحی میں پھول نرگس کا

انہیں حقیقتِ دریا کی کیا خبر امجد
جو اپنی رُوح کی منجدھار سے نہیں گزرے

یہ مجموعہ "مرے خدا مرے دل" تاج سعید نے ترتیب دیا ہے۔ تاج سعید کی ادبی کاوشوں اور کارناموں سے کسے اِنکار ہے قند کے تمام خصوصی نمبر بیش بہا ادبی جواہر پاروں کے خزانے ہیں جہاں نقوش کے محمد طفیل تھک کر بیٹھ گئے وہاں یہ عَلَم تاج سعید نے بلند رکھا اس میں شبہ نہیں کہ مجید امجد کی وفات پر مختلف جریدوں نے مجید امجد کی زندگی اور فن کے بارے میں کچھ نہ کچھ مواد

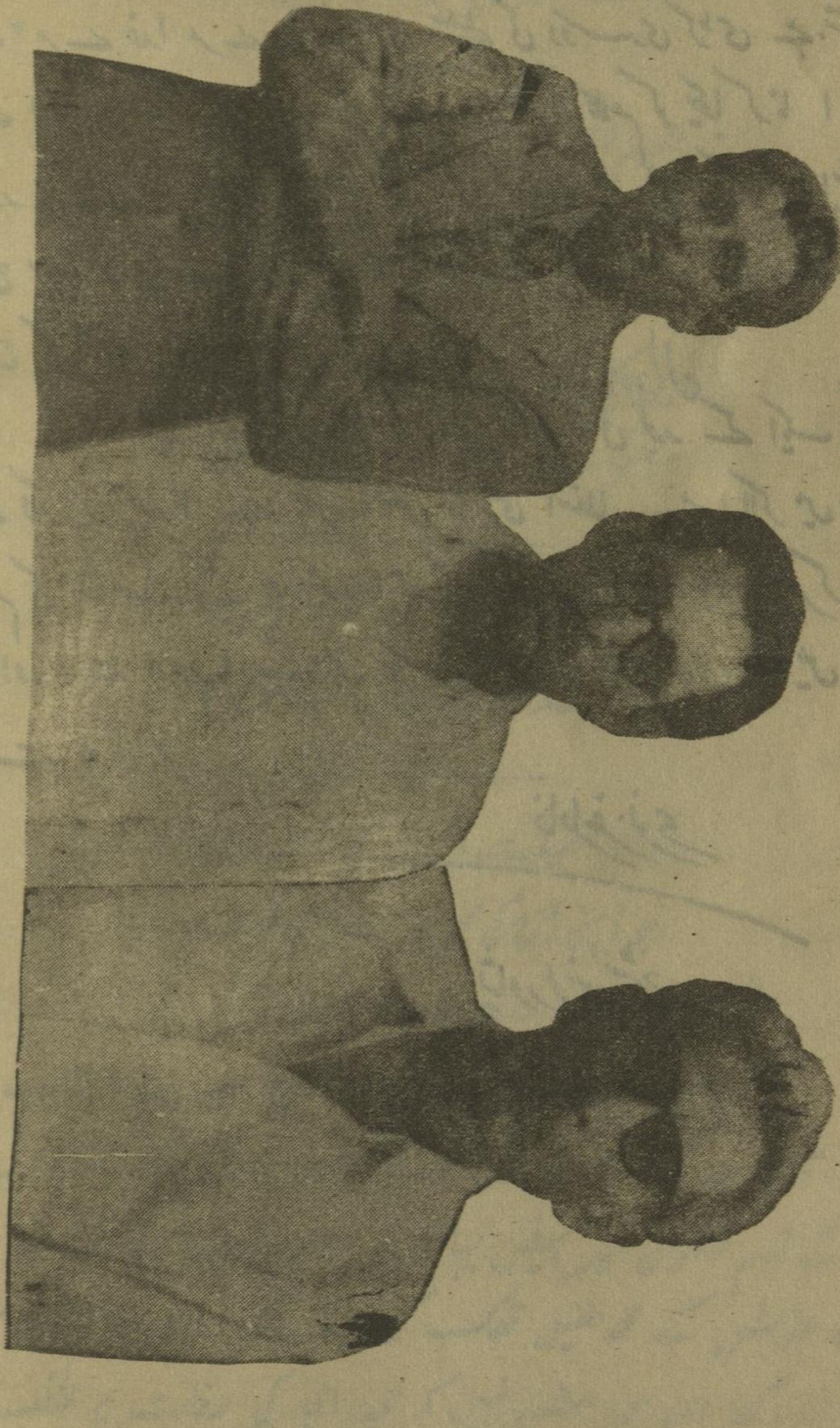
ضرور شائع کیا، لیکن قند کا مجید امجد نمبر ایک ایسی بھرپور اور واحد کوشش ہے جو اردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم ترین مقام حاصل کرلے گی۔" مرے خدا مرے دل' اسی سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ شب رفتہ کے بعد مجید امجد کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کو یکجا کرنا اپنے طور پر بڑی جانکاہی کا کام تھا اس مجموعے کو شائع کر دینا اپنی جگہ تاج سعید کا ایک اور بڑا کارنامہ ہے اور اس کے لئے وہ ہر طرح کی تحسین کے مستحق ہیں۔

مجید امجد مرحوم کا جو ادبی اثاثہ ~~لائل پور~~ ساہیوال کے ایک بینک کے لاکر میں محفوظ ہے ہمیں اس کا بھی انتظار ہے، لاکر میں بند کلام کی اشاعت کے بعد مجید امجد کی شخصیت اور زیادہ نکھر کر اُبھرے گی اور اسے اردو ادب میں اس کا جائز مقام دلانے میں ممد ثابت ہوگی ::

خاطر غزنوی

پشاور یونیورسٹی

۷ر جولائی ۱۹۷۵ء



خودنوشت

تاریخ پیدائش : ۲۹ جون ۱۹۱۴ء

ولادت : جھنگ مگھیانہ

۱۹۱۰ء میں اسلامیہ ہائی اسکول سے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۲ء میں گورنمنٹ کالج جھنگ سے انٹرمیڈیٹ اور ۱۹۳۴ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ چند دن ایک قانون گو صاحب کے ماتحت ۱۹۳۵ء کے آئین کے تحت ووٹروں کی لسٹیں بنانے کا کام کیا۔ کچھ دن ایمپائر آف انڈیا انشورنس کمپنی کا ایجنٹ رہا۔ اس کے بعد ۱۹۴۰ء تک اخبار "عروج" جھنگ کی ادارت کے فرائض سرانجام دیئے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اخبار عروج کو چھوڑنا پڑا اور دفتر ڈسٹرکٹ بورڈ کے ایک شعبہ میں تین چار سال کام کیا۔ ۱۹۴۴ء میں سرکاری ملازمت اختیار کی اور لائل پور، گوجرہ، سمندری، ٹانڈلیانوالہ، جڑانوالہ، چیچہ وطنی، مظفرگڑھ، لیہ، منٹگمری، پاک پتن، اوکاڑہ، عارف والا، راولپنڈی، لاہور، شاہدرہ تعینات رہا۔ آج کل ساہیوال میں ہوں۔ اس عرصے میں شعر کے لئے کس وقت خامہ فرسائی کی ہے، یاد نہیں پڑتا جہاں بھی رہا ہوں دیار جھنگ کی عطا کی ہوئی وارفتگی میرے ساتھ رہی ہے۔

مجید امجد

(تاریخِ وفات : ۱۱ مئی ۱۹۷۴ء)

برادرم تاج سعید صاحب:

تسلیم!

آپ کے پرچے کے لیئے ایک نظم ارسال ہے۔ پچھلے دنوں کہی تھی، خدا کرے آپ کو پسند آجائے۔

ناصر شہزاد صاحب سلام کہتے ہیں،

پرچہ کب آئیگا، آپ کیسے ہیں،

آپ کا

مجید امجد

F-207 سیٹلائٹ ٹاؤن

ساھیوال (منٹگمری)

24.5.71

نہ کوئی سلطنتِ غم ہے
نہ اقلیمِ طرب

کیا کہوں، کتنے غموں ــ کتنے غموں کی شکن آلود بساط!
وقت کے گھومتے زینوں پہ مرے رکتے ہوئے قدموں کے سات
کس طرح بھیتی لپٹی ہی چلی آئی ہے
کیا بتاؤں، یہ کہانی بڑی طولانی ہے

یہ مرا قصۂ غم کون سنے؟ کس کو سناؤں؟ کس کو
اپنے احساس کا وہ جلتا ہوا زہر پلاؤں، جس کو
پیتے پیتے مری اک عمر کٹی ہے اک عمر!

دیکھتے ہو ــــ وہ جو اک جادۂ نورانی ہے
وہ جو اک موڑ ہے اور وہ جو جھروکا ہے سرِ بام بلند
کبھی پہنچی نہیں جس تک سحر و شام کے سایوں کی کمند
وہ جو جھکتی ہوئی مڑتی ہوئی دیواریں ہیں
جن کا منصب انہی گلیوں کی نگہبانی ہے
وہ جو ہر شام انہی گلیوں میں کوئی مست سی لے

بند ہوتے ہوئے دروازوں کے آہنگ میں گھل جاتی ہے
وہ خموشی، سفرِ شب کے تسلسل کی نقیب
جس کی میت پہ اندھیروں نے ردا تانی ہے
میں نے اک عمر، اسی معمورۂ ظلمات میں رقصاں جولاں
ہر قدم اپنے ہی قدموں کی صداؤں سے گریزاں، لرزاں
جگرِ جام سے چھینے ہوئے نشوں میں مگن
خاک ان راہوں کی یوں خاک بہ سر چھانی ہے
جس طرح ایک سہارے کی تمنا میں کسی ٹوٹتے تارے کی حیات
مہ و انجم کے سفینوں کی طرف اپنے بڑھائے ہوئے ہات
خمِ افلاک سے ٹکرا کے بھسم ہو جائے
(ان خلاؤں میں کسے تابِ پُر افشانی ہے!)
میں بھی پلکوں پہ امنگوں کے دیئے لے کے گرجتے ہوئے طوفانوں میں
منتظر تھا کہ اچانک کہیں باغوں میں، بیابانوں میں!
آکے بس جائے کسی نغمۂ شیریں کی بہار
یہ مرے گرد جو پھیلی ہوئی ویرانی ہے
کب یہاں ریزۂ صد ساغرِ بشکستہ سے کلیاں پھوٹیں

میں نہیں کہتا، کہ کلیاں نہیں مہکیں مرے گلزاروں میں
مجھ کو غم ہے وہ اک لمحۂ نایاب کہ جو
ماحصلِ سلطنتِ عالمِ امکانی ہے
جب مری زیست سے ٹکرا کے بھسم ہو بھی گیا تب مجھے معلوم ہُوا

تب میں سمجھا کہ یہ راہیں، یہ گھروندے ، یہ پھبکتی دنیا
اب یہ سب کچھ، غمِ جاوید کی اک دھڑکن ہے
اب یہی زخم ہیں اور شغلِ مگس رانی ہے

آج بھی جب کہیں رستے ہیں، کسی موڑ، کسی منزل پر
کسی دیوار سے کنکر بھی پھسل جاتا ہے
کوئی دامن، کہ جسے نازِ گل افشانی ہے
دھوپ میں سوکھتی خرما کی چنگیروں سے بھرے کوٹھوں سے
ایک پل کے لئے اڑتا ہے، سمٹتا ہے، تو دھیرے دھیرے
کوئی لے سی مرے احساس میں بھر جاتی ہے
تارِ بربط کی کوئی لرزشِ پنہانی ہے
جو شب و روز کے ایوان میں فغاں بن کے بکھر جاتی ہے
آسمانوں سے، زمینوں سے، کسی دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
کوئی چپکے سے مرے کان میں کہہ جاتا ہے
سنتے ہو؟ کس کی یہ آواز ہے؟ پہچانی ہے

یوں کب تک صبح و شام جلیں
بے سود جلیں، ناکام جلیں
یہ سب زنجیریں توڑ بھی دیں
اب اس بستی کو چھوڑ بھی دیں
جب دنیا والے سو جائیں

بیٹھے سپنوں میں کھو جائیں
جب چلتے دریا تھم جائیں
تاروں کی نگاہیں جم جائیں
جب آگ بجھے چوپالوں کی
جب آنکھ لگے رکھوالوں کی
دیوار و در سے چمٹتے ہوتے
سائے کی طرح سمٹتے ہوتے
دو بھک منگوں کے بھیس میں ہم
جا نکلیں اک اور دیس میں ہم
کچھ دور افق کے پار، اُدھر
ہے ایک نیا سنسار اُدھر
خوشیوں کی، سنگاروں کی دنیا
پھولوں کی، بہاروں کی دنیا"

آج اس فرصتِ یک گام کو روتا ہوں جب اک لغزشِ پا
چھین کر لے گئی مجھ سے وہ امنگوں کی جھلکتی دنیا
آہ وہ دنیا، جسے کھو کے میں پھر پا نہ سکا
یوں تو آفاق میں دنیاؤں کی ارزانی ہے
ان خلاؤں میں ستارے بھی ہیں، خورشید بھی ہے، ماہ بھی ہے
کون جانے کہ زمانے کے سمندر کی کوئی تھاہ بھی ہے
لیکن اک دنیا، جسے کھو کے میں پھر پا نہ سکا

جس کے ماتم میں مری چاک گریبانی ہے
میری سم خوردہ تمناؤں کی نظروں سے گریزاں ہی رہی
لاکھ ڈھونڈا، مگر افسوس، بس اک رنج پشیماں نگہی
بوجھ بن کے مری تقدیر کی پلکوں پہ رہا
اب مرا دل ہے کہ اک عالمِ حیرانی ہے
اب یہ دنیا، یہ صدا کوشش نصیبوں سے بھرے شہر و دیار
غموں خوشیوں کے جھمیلوں میں نہاتی ہوئی روحوں کا نکھار
مجھ سے پوچھو تو مرے سامنے اب یہ دنیا
"ورقِ مصحفِ اندوہ گراں جانی ہے"

سوچتا ہوں یہی دو گھونٹ جو میں نے خمِ دوراں سے پیے
یہی دو سانس شبستانِ ابد میں یہی دو بجھتے دیئے،
دوش و فردا کی فصیلوں میں یہی دور خنے
یہی جو سلسلۂ زندگیٔ فانی ہے!
کیا اسی ساعتِ محرومیٔ غم تاب کی خاطر میں نے
وسعتِ وادیٔ ایام میں کانٹوں کے قدم چومے تھے؟
لاکھوں دنیاؤں کے لٹتے ہوئے کھلیانوں سے
میرا حصّہ، یہی میری تہی دامانی ہے؟
کہ جب اس سطحِ خروشندہ پہ ڈھونڈوں میں کوئی رختِ طرب
کوئی مکھ، کوئی نگہ، کوئی تبسم، کوئی جینے کا سبب
آسمانوں سے صدا آئے،" تو کیا ڈھونڈتا ہے؟

تیرا ساماں، تو یہی بے سروسامانی ہے!؟"

عقل حیران ہے، یہ طفرہ حجاباتِ حریم اسرار!
عقدۂ راحت و غم، رازِ جہانِ گل و خار
پا بہ زنجیر ارادوں کا خروشِ پیہم!
یہی مستقبل معمورۂ انسانی ہے؟
کس کی فتراک میں ہیں عرشِ بریں فرشِ زمیں! کون کہے
پسِ صد پردۂ افلاک کوئی ہے کہ نہیں! کون کہے
جانے کن گہرے دھندلکوں سے ضیا پاتی ہے
درحقیقت یہ حقیقت کی جو تابانی ہے،
اتنے زخموں سے سجا کر دلِ بے تاب کی پژمردہ جبیں
کس نے بھیجا ہمیں اس جلتے ہوئے دیس میں! معلوم نہیں،
یوں نہ اپنے دمِ امّید کو بہلائے کوئی
کون کہتا ہے گلستاں میں بہار آنی ہے

جس میں آئی ہے کہ اب بارِ غمِ زیست پہ احساں دھر کر
دیگِ گردوں میں ابلتے ہوئے زہراب سے اک خم بھر کر
دیگِ گردوں کہ ابد زنگ شکم میں جس کے
کھولتے دردوں کا ہنگامۂ لافانی ہے
اسی زہراب سے خم بھر کے پٹخ دوں افقِ دوراں پر
آگ ہی آگ برسنے لگے اس پھولوں بھرے بستاں پر

اب یہی دھن ہے کہ اس ظلمتِ بے پایاں کو
جو مری رُوح کے ایوان کی زندانی ہے
اٹھ کے پھیلادوں انہی اونچے درختوں سے ڈھکی راہوں پر
انہی گدرائی ہوئی دھوپ میں لہراتی چراگاہوں پر

اب ارادہ ہے کہ ان بس بھرے ارمانوں کو
جن کے سایوں میں مری زیست کی ویرانی ہے
گھول دوں جھومتے جھونکوں کے چھلکتے ہوتے پیمانوں میں
سینۂ دشت پہ بجتی ہوئی شہنائیوں کی تانوں میں

چاہتا ہوں کہ یہ زیتون کے جنگل کا سکوت
جس کی وسعت ہے کہ اِک عالمِ حیرانی ہے
میری کھوئی ہوئی دنیاؤں کے کہرام سے تھرّا اٹھے

اب یہ ٹھانی ہے کہ جمتی ہوئی بوندوں کے یہ بے کل چھینٹے
تیز جھالوں کے یہ چابک سے کہ جن کی زد پر
کبڑے رستوں کی تھکی پیٹھ کی عریانی ہے

یہ دھواں دھوپ ترائی، یہ دھواں دھار پہاڑوں کی فصیل
دور تک چوٹیوں اور بدلیوں کے دیس کی سرحدِ جمیل
برف سے بدلیاں، جن کے لب تر سے پیوست
برف کی چوٹیوں کی دودھیا پیشانی ہے

ہاں یہ سب سلسلۂ رنگ، یہ گہوارۂ حسن و افسوں
میں اسے اپنی دُکھی رُوح کی ان راگنیوں سے بھر دوں
جن کی لہریں کبھی آنسو ہیں، کبھی آہیں ہیں
جن کی تقدیر کبھی آگ، کبھی پانی ہے

کوئی غایت، کوئی منزل، کوئی حاصل سفرِ ہستی کا؟
کوئی مقصود بلندی کا کہ مفہوم کوئی پستی کا،
کوئی مشعل بھی نہیں، کوئی کرن بھی تو نہیں
شب اندھیری ہے، گھٹا ٹوپ ہے، طوفانی ہے!
بولو اے نغمہ سرایانِ تحیّر کدۂ کاہکشاں
میں کہاں جاؤں، کہاں جاؤں، کہاں جاؤں، کہاں

نغمۂ کواکب [۱]

دائموس:

ناچ، ناچ، جھوم، جھوم
گھوم، گھوم، گھوم، گھوم
دیکھنا ادھر ضرور، اِک نظر،
ناچتا ہے نزد و دور، بے خبر

---

[۱] دائموس، فیبوس، ارناؤس، پلوطو، ستاروں کے نام

دامنِ نگارِ نور، تھام کر
کہکشاں کے موڑ پر
فاصلوں کا اِک ہجوم
ناچ، ناچ، گھوم، گھوم
وسعت ابد پناہ، اِک ترنگ
عالمِ شبِ سیاہ اِک امنگ
منزلیں نشانِ راہ سحر رنگ
شعلہ شعلہ، انگ انگ
آگ آگ، روم، روم
ناچ، ناچ، گھوم، گھوم

فینوس: دیئے جلتے رہے، دیئے جلتے رہے
گھم گھم اڑے، دھوئیں کے دل
جگ جگ پھیل گئے کاجل
دم دم، دھم دھم گرے محل
مٹتی ہوئی صدیوں میں پل
ڈھلتے رہے
دیئے جلتے رہے
کتنے زمانے، کتنے سپن!
توڑ گئے اپنے درپن

نیر بہاتے رہے نینن
وقت کے جھکڑ گگن گگن

چلتے رہے

دیئے جلتے رہے

اندھیاروں کے زہر پیئے
آنکھوں کو گل رنگ کیے
امر اُجالے، کو میں لئے
جیون کی منڈلی میں دیئے

چلتے رہے
دیئے جلتے رہے، دیئے جلتے رہے

ارناؤس: بھنور بھنور مری نوکا!
کوئی ساحل ہے نہ کنارا،
اک پھیلتا بڑھتا دھارا
بہے نگر نگر

مری نوکا، بھنور، بھنور

ہر آن رُتوں کا میلہ
ہر سمت سمے کا ریلا
چلے گھم گھمر

مری نوکا، بھنور، بھنور

بوجھ اتنے ہیں کڑیل جن کے
یہ دُکھ سُکھ، بہتے تنکے
گریں اُبھر اُبھر

مری نوکا، بھنور بھنور

کہتی ہوئی من کی بانی
تقدیرِ جہاں کی رانی
پھر سے سنور سنور

مری نوکا، بھنور بھنور

پلوطو
کتنی اندھیری رات ہے، چمکو
دیکھو تیرگیوں کے فتنے
کتنے
روند روند چلے عالم عالم کو، چمکو
پیہم
گھور رہے ہیں طوفاں ہم کو، چمکو
سُکھ میں سمولو اِک اِک پل کو،
جھلکو
من میں بجھالو شعلۂ غم کو، چمکو
آتے ہوئے قرنوں کا تبسّم

ہم تم

جگ مگ دمکو، جھم جھم جھمکو، چمکو!

کتنی اندھیری رات ہے، چمکو

کرۂ ارض:

نہ عکسِ خاک کہیں اور نہ رقصِ نور کہیں
نہ کوئی وادیِ ایمن نہ شمعِ طور کہیں
بجھی ہے راکھ میں غلطاں مئے طہور کہیں
پڑا ہے شیشۂ افلاک چور چور کہیں
پلوں کے جھنڈ میں لرزے ابد کی پینگ کوئی
نظر کے سامنے، حدِ نظر سے دور، کہیں
مقدروں کے جہاں در جہاں اندھیروں میں
بھٹک نہ جائے مرا شوقِ ناصبور کہیں
یہ اضطرابِ مسلسل کی خونچکاں گھڑیاں
ہے ان سے بڑھ کے کوئی دولتِ سرور کہیں
اگر ہمیں بھری دنیا میں سکرا نہ سکے
تو ڈول جائیں گے یہ سلسلے ضرور کہیں

شہر در شہر منادی ہے کہ:

اے خندہ فروشانِ حیات
ہر بجھی روح کے آنگن میں کھلا ہے چمنِ امکانات!

نہ کوئی سلطنتِ غم ہے نہ اقلیم طرب!
زندگی ہی فقط آئین جہاں بانی ہے!

جانے کس تیرہ افق سے یہ گھٹاؤں کے بھرکتے سائے
ماہتابوں کے چمکتے ہوئے سینوں سے نتھر کر آئے
ساتھ لے کر وہ خنک موج خماریں جھونکے
جن کی زد میں مری تپتی ہوئی پیشانی ہے

اپنے سینے میں جگا کر انہی دردول انہی یادوں کے فسوں
پھر تمناؤں کے تصویر کدے میں نگراں بیٹھا ہوں
سامنے صفحۂ صد رنگِ رموزِ کونین
کانپتی انگلیوں میں مُوقلمِ مانی ہے!

مرے خدا مرے دل

مرے ضمیر کے بھیدوں کو جاننے والے
تجھے تو اس کی خبر ہے، مرے خدا، مرے دل
کہ میں ان آندھیوں میں، عمر بھر، جدھر بھی بہا
کوئی بھی دھن تھی، میں اس لہر کی گرفت میں تھا
جو میری سوچ کی سچائیوں میں کھولتی ہے
ہے جس کی روح میں تری ضو!

مرے خدا، مرے دل
مرے لہو میں، تری لو ہے، دھڑکنوں کا الاؤ
تجھے تو اس کی خبر ہے

مرے خدا، مرے دل
کہ اس طلسمِ زیاں کے، کسی جھمیلے میں
ذرا کبھی، جو قدم میرے ڈگمگا بھی گئے
تو اک خیال ابد موج سلسلوں کا خیال
مرے وجود میں چنگاریاں بکھیر گیا

نہ دکھتی سانس کے ارماں، نہ جلتی مٹی کے بوجھ
نہ کوئی روگ، نہ چنتا، نہ میں، نہ میرے جتن
جو مجھ میں تھا بھی کوئی گن، ترے ہی گیان سے تھا
کچھ اور ڈوب کے گہرائیوں میں جب دیکھا
تو ہر سلگتی ہوئی قدر کے مقدر میں
نہاں تھے تیرے تقاضے!

مرے خدا، مرے دل

ہیں تیری کرنوں میں کڑیاں چمکتے قرنوں کی
تجھے تو اس کی خبر ہے

مرے خدا، مرے دل

کہ اس کرے پہ ہے جو کچھ بھی اس کے پہلو میں ہیں
وہ شعلے، جن پہ شکن ہے تری ہی کروٹ کی
ترے ہی دائرے کا جزو ہیں، وہ دور، کہ جب
چٹانیں پگھلیں، ستارے جلے، زمانے ڈھلے
وہ گردشیں جنہیں اپنا کے اَن گنت سورج
ترے سفر میں بجھے، تو انہی اندھیروں سے
دوام درد کی اک صبح ابھری، پھول کھلے
مہک اٹھی تری دنیا

مرے خدا، مرے دل

گھلا ہوا مری سانسوں میں ہے سفر تیرا
تجھے تو اس کی خبر ہے

مرے خدا، مرے دل

کہ گو یہی مرا پیکر، خمیرِ خاک سے ہے
مگر اسی مرے تپتے بدن کی بھٹی سے
کشید ہوتی ہوئی ایک ایک ساعتِ زیست
وہ گھونٹ زہر کا ہے جو مجھی کو پینا پڑا
یہ زہر کون پئے؛ کون اپنے سینے میں
یہ آگ انڈیل کے، ان ساحلوں سے بھید چنے
جہاں پہ بکھرے ہیں، صدہا صداقتوں کے صدف
یہ زہر کون پئے! کون جلتی آنکھوں سے
غروبِ وقت کی خندق کے پار دیکھ سکے
جہاں ازل کے بیاباں میں، عمر پیما ہے
حقیقتوں کا وہ دھارا، کہ جس کی لہروں میں آج
گلوں کا رس بھی ہے، فولاد کا پسینہ بھی!
مرا شعور انہی گھاٹیوں میں، بھٹکا ہے!
قدم قدم پہ، مری ٹھوکروں کی زد میں رہیں
کرخت ٹھیکریاں، ان کٹھور ہاتھوں کی
جو زندگی ہیں، ترے آستاں پہ جھک نہ سکے
قدم قدم پہ، اسی فاصلوں کے سنگم پر
بس اک مجھی کو، اس انمٹ تڑپ سے حصّہ ملا

تری جرس کی صدائیں ہیں، ارتجِگے جس کے
یہی تڑپ، تری کایا! یہی تڑپ، مرا انت!
جو انت بھی ہو سو ہو، میں تو مٹتی مٹی ہوں
دھڑکتی ریت کے بے انت جھگڑوں میں سدا
رواں رہے ترے عمل

مرے خدا، مرے دل
تری ہی آگ کی میٹھی سی آنچ میں مرے دکھ
یہ راز تو ہی بتا

مرے خدا، مرے دل
یہ بات کیا، کہ ترے بے خزاں خزانوں سے
جو کچھ ملا بھی ہے مجھ کو، تو اک یہ ریزۂ درد
ہیں جس کی جھولی میں کھلیان تیرے شعلوں کے
اور اب کہ سامنے، جلتی حدوں کی سرحد ہے
ہر ایک سمت، مری گھات میں ہیں وہ روحیں
جو اپنے آپ میں اک راکھ کا سمندر ہیں
یہ سائے، بس بھرے، ذی جسم، آہنی سائے
انہی کے گھیرے میں ہیں اب، یہ بستیاں، یہ دیار
کہیں یہ سائے ــــ جو پتھرائی آرزوؤں کو
سرابِ زر کی کشش بن کے گدگداتے ہیں
مری لگن کو نہ ڈسنے لگیں ــــ میں ڈرتا ہوں
کہیں یہ سائے ــــ یہ کیچڑ کی مورتیں ــــ جن کے

بدن کے دھبوں پہ رخت حریر کی ہے چبھن
مری کرن کی نہ چھب نوچ لیں — میں ڈرتا ہوں
کہیں یہ آگ نہ بجھ جائے، جس کے انگ میں ہیں
ترے دوام کی انگڑائیاں! — میں سوچتا ہوں
نہیں — یہ نہ ہو سکے گا! — جو یوں ہوا بھی تو پھر
نہیں! ابھی تو یہ اک سانس، ابھی تو ہے کیا کچھ!
ابھی تو جلتی حدوں کی حدیں ہیں لامحدود
ابھی تو اس مرے سینے کے اک گوشے میں
کہیں لہو کے تڑ بڑوں میں، برگِ مرگ پہ اک
کوئی لرزتا جزیرہ سا تیرتا ہے، جہاں
ہر اک طلب تری دھڑکن میں ڈوب جاتی ہے
ہر اک صدا ہے کوئی دور کی صدا

مرے دل

مرے خدا، مرے دل

مشرق و مغرب

نہ کوئی مشرق
نہ کوئی مغرب
بس اک بھپکتی گداز مٹی
کی چادرِ سبز، جس کے دامن
میں کل تھے انبارِ گندم و جو
اور آج انبارِ سیم و آہن

یہ کون سمجھے
یہ کون جانے
کہ اس تڑپتے ہوئے زمانے
کے سائے میں ڈولتی سی شمعیں
کہ روشنی، جو پیالۂ گِل
صراحیِ سنگ، کوزۂ مِس
کو پھاند کر، شہر و دشت و ساحل
سے اٹھتے گرز و سنان و خنجر
پہ جم گئی تھی وہ کانپتی لو
جو آج بھی طاقِ زندگی پر
سسک رہی ہے، اسی کا پرتو

جہانِ نو کے فروغِ منزل
میں ڈھل گیا ہے
عجیب قصہ ہے، ضربِ خارا
سے ذہنِ فولاد جل اٹھا ہے

نہ کوئی مشرق
نہ کوئی مغرب
مگر وہ اک زینۂ مراتب
جوان گنت بے زباں غلاموں
کی ٹوٹتی پسلیوں پہ، کل بھی
ہزار کف در دہاں خداؤں
کے بوجھ سے کپکپا رہا تھا"
اور آج بھی اِک وہی ترازو
کہ جس میں زنجیر پوش روحوں
کے شعلہ اندام دست و بازو
بہ نرخِ یک اشک تُل رہے ہیں
اگر یہی تھا نصیبِ دوراں
یہ نالۂ غم، یہ اِک مسلسل
خروشِ انبوہِ پابجولاں
ازل کی حد سے نسلِ آدم
کی یہ کراہیں، جو روز و شب سے
عمیق سناٹوں سے پیہم

ابھر رہی ہیں، یہ چشم ولب کے
فسانہ ہائے سرشک و شیون
اگر مقدر یہی تھا اپنا
تو یہ مقدر اٹل نہیں تھا!

یہی ہے مشرق
یہی ہے مغرب

وہ پارہ ہائے سفال و خارا
وہ عقل حیراں کی کارگاہیں
وہ جنسِ نایاب، کل ہمارے
جہانِ صد ریزۂ خذف میں
ہماری دولت تھی، ہم خدا تھے
اور آج بھی یہ شرار پیکر!
حقیقتوں کے طلسم سوزاں
یہ وسعتِ بحر و بر میں مضطر
ضمیرِ آہن کی جلتی سانسیں
یہ ذرے ذرے کے قلب پیچاں
میں کھولتی قوتوں کے طوفاں
زمانہ ہے جن کی رو میں تنکا
جو آج بھی ہو وجود ان کا،
ہماری مٹھی میں، ہم خدا ہیں
سیاہیوں کے چھلکتے خم سے
اچھلتی کرنوں کا حوصلہ ہیں۔

○

اور اب یہ کہتا ہوں، یہ جرم تو روا رکھتا
میں عمر اپنے لئے بھی تو کچھ بچا رکھتا
خیال صبحوں کرن ساحلوں کی اوٹ، سدا
میں موتیوں جڑی بنسی کی لے جگا رکھتا
جب آسماں پہ خداؤں کے لفظ ٹکراتے
میں اپنی سوچ کی بے حرف لو جلا رکھتا
ہوا کے سایوں میں، ہجر اور ہجرتوں کے وہ خواب
میں کاش دل میں وہ سب منزلیں سجا رکھتا
انہی حدوں تک اُبھرتی یہ لہر جس میں ہوں میں
اگر میں سب یہ سمندر بھی وقت کا رکھتا
پلٹ پڑا ہوں شعاعوں کے چیتھڑے اوڑھے
نشیبِ زینۂ ایّام پر عصا رکھتا!
یہ کون ہے جو مری زندگی میں آ کر ......
ہے مجھ میں کھوئے مرے جی کو ڈھونڈھتا رکھتا

دوام

کڑکتے زلزلے اُمڈے، فلک کی چھت گری، جلتے نگر ڈولے
قیامت آگئی، سورج کی کالی ڈھال سے ٹکرا گئی دنیا
کہیں بجھتے ستاروں، راکھ ہوتی کائناتوں کے
رکے انبوہ میں، کروٹ دوسالوں کی
کہیں اس کھولتے لاوے میں بل کھاتے جہانوں کے
سیہ پشتے کے اوجھل، ادھ کھلی کھڑکی
کوئی دم توڑتی صدیوں کے گرتے جھرمٹے سے جھانکتا چہرہ
زمینوں، آسمانوں کی دہکتی گرد میں لتھڑے
خنک ہونٹوں سے یوں پیوست ہے اب بھی
ابھی جیسے سحر بستی پہ جلتی دھوپ کی مایا انڈیلے گی
گلی جاگے گی، آنگن سمہائیں گے
کوئی نیندوں لدی پلکوں کے سنگ اٹھ کر
کہے گا ـــــ رات کتنی تیز تھی آندھی

دیکھ، اے دل

دیکھ اے دل، کیا سماں ہے، کیا بہاریں شام ہے
وقت کی جھولی میں جتنے پھول ہیں انمول ہیں
نہر کی پٹڑی کے دو رویہ، مسلسل، دور تک
برگدوں پر پنچھیوں کے غل مچاتے غول ہیں

دیکھ اے دل، کتنے ارمانوں کا رس برسا گئیں
بدلیاں، جب ان پہ چھینٹے نور کے چھن کر پڑے
کتنی کومل کامناؤں کی کہانی کہہ گئے!
پیپلوں کے پیلے پیلے پات پتھ پتھ پر پڑے

دیکھ اے دل، اس رسیلی رُت کے کتنے روپ ہیں
جھومتے جھونکے ہیں، جھکتی جھاڑیوں کے جھنڈ ہیں
ہائے ان پھیلی ہوئی پھلواڑیوں کے درمیاں
یہ تپتی ہوئی تنہائیاں — اور ایک میں

○

برس گیا بہ خرابات آرزو، ترا غم
قدح قدح تری یادیں، سبو سبو ترا غم

ترے خیال کے پہلو سے اٹھ کے جب دیکھا
مہک رہا تھا زمانے میں چار سو ترا غم

غبارِ رنگ میں رس ڈھونڈتی کرن، تری دھن
گرفتِ سنگ میں بل کھاتی آبِ جو، ترا غم

ندی پہ چاند کا پرتو، ترا نشانِ قدم
خطِ سحر پہ اندھیروں کا رقص، تو، ترا غم

نخیلِ زیست کی چھاؤں میں نے بہ کب، تری یاد
فصیلِ دل کے کلس پر ستارہ جو، ترا غم

طلوعِ مہر، شگفتِ سحر، سیاہیِ شب
تری طلب، تجھے پانے کی آرزو، ترا غم

نگہ اٹھی تو زمانے کے سامنے ترا روپ
پلک جھکی تو مرے دل کے روبرو، ترا غم

بارکش

چیختے پہیے، پتھ بہت ریلا، چلتے بجتے سُم!
تپتے لہو کی رو سے بندھی ہوئی اک لوہے کی چٹان
بوجھ کھینچتے، چابک کھاتے جنور! ترا یہ جتن
کالی کھال کے نیچے، گرم گٹھیلے ماس کا مان

لیکن ابلتی آنکھیں، آگ بھری، پُر آب!
سارا بوجھ اور سارا کشٹ، ان آنکھوں کی تقدیر
لاکھوں گیانی من میں ڈوب کے ڈھونڈیں جگ کے بھید
کوئی تری آنکھوں سے بھی دیکھے دنیا کی تصویر

موانست

رات اچانک پھاٹک کا اک پہیہ رینگا
پگڈنڈی پر اک آہٹ نے ٹھوکر کھائی

کالے کوس پروں کو اوڑھ کے سونے والی وحشت
پاس کے پیڑ پہ، کندے جھٹک کر چونکی، چیخی
جیسے کوئی اس کی طرف جھپٹا ہو
ڈرتے ڈرتے اس نے نیچے اندھیارے میں جھانکا

"او - یہ تو ایک وہی سایہ ہے
جو روشنیوں کے پہلے پھیرے سے بھی پہلے
روز ادھر سے گزرتا ہے اور پہلی پتنگ کے پڑنے سے بھی پہلے
چلتا چلتا اس باڑی میں کھو جاتا ہے ....
آج تو جانے کس لرزاں دھبے سے ٹکرایا وہ ...... پگلا!"

کوئل نے یہ سوچا - پھر بے کھٹکے
پتوں کی اس سیج پہ تھوڑی دیر کو اونگھ گئی وہ
بوئے سحر کے مست بلاوے پر بے ساختہ کوک اٹھنے سے پہلے،

ثمرِ خوں

یہ قصّہ حاصلِ جاں ہے، اسی میں رنگ بھریں
لہو کی لہر کے لہجے میں، اپنی بات کہیں
دھوئیں میں آگ کے شیشے ہیں، زخم ہیں۔ اب ہم
انہی کڑکتے دھماکوں سے اپنے گیت چنیں!
ہمارے جیتے گھروندے، ہمارے جلتے حسن
یہ مورچے — یہ جیالے سپاہیوں کی صفیں
جلی زمین، سیہ دھول، صدقِ خوں کی مہک
قدم قدم پہ یہاں — مہروماہ کی سجدہ گہیں
یہ دن بھی کتنے مقدّس ہیں، بے بہا ہیں، کہ آج
ہمارا حصہ بھی ہے طالعِ شہیداں میں
اسی تڑختی ہوئی باڑھ میں، ہمیں کو ملیں
سنورتی، سجتی، نکھرتی، دلوں کی اقلیمیں
یہ جینے والوں نے دیکھا کہ اس گروہ میں تھے
وہ جاں ہار — کہ جو موت کو بھی فتح کریں
میں ان کو طاقِ ابد سے اتار لایا ہوں
یہ شمعیں، جن کی لویں میرے آنسوؤں میں جلیں

جب اِک چراغِ راہ گزر کی کرن پڑے
ہونٹوں کی لَو لطیف حجابوں سے چھن پڑے

یہ کس حسیں دیار کی ٹھنڈی ہوا چلی!
ہر موجۂ خیال پہ صد ہا شکن پڑے

اک پل بھی کنجِ دل میں نہ ٹھہرا وہ رہ نورد
اب جس کے نقشِ پا ہیں چمن در چمن پڑے

اِک جَست اس طرف بھی، غزالِ زمانہ رقص
رہ تیری دیکھتے ہیں خطا و ختن پڑے

جب انجمن تموّجِ صد گفتگو میں ہو
میری طرف بھی اِک نگۂ کم سخن پڑے

صحرائے زندگی میں جدھر بھی قدم اٹھیں
رستے میں ایک آرزوؤں کا چمن پڑے

اس جلتی دھوپ میں یہ گھنے سایہ دار پیڑ
میں اپنی زندگی انہیں دے دوں جو بن پڑے

امجد طریقِ مے میں ہے یہ احتیاط شرط
اک داغ بھی کہیں نہ سرِ پیرہن پڑے

ایک شام

دیکھ، پھر آج بھی اس نگری میں
شام کی کرنیں، تیرے ساتھ چلی ہیں
تیرے ساتھ چلی ہیں

دیکھ اب، کہیں کہیں ان لمبی، لال لووں کی لڑیاں میلی دھوپ میں بجھ کے
رستوں سے پیوست پڑی ہیں
کہیں کہیں یہ زرد، سلگتے، تیکھے، بان دلوں میں چبھ کر ٹوٹ گئے ہیں!

آسمان سے لے کر سطح زمیں تک
ہر سُو، پھیل گئی ہیں لاکھ خراشیں
دکھتی خراشیں، گہری، الجھی ہوئی، لہریلی!
پگھلی ہوئی، بے جسم، سلاخیں، پتلی پتلی، پیلی پیلی،

دیکھ، ان سیّال سلاخوں کی چمکیلی باڑھ پہ جلنے پھول تھے، ان کو،
توڑ کے لے گئے بے سدھ جھونکے
باقی صرف اک سرد سیاہ الجھاؤ

بجھتی ہوتی اک سانس کے قیدی!
دیکھ، اب تیرے سامنے ہیں وہ سارے سرد سیاہ زمانے
جن کے بھنور میں تیرے دیپ کی لو اس وقت سے لرزاں ہے
پہلا سورج، صدیوں پہلے، جب ترے دل میں ڈوبا تھا!

نیلم جڑے پیالوں میں

اور ..... ان خارزاروں میں چلتے چلتے خیال آتا ہے
سدا ہمارے دلوں میں چٹکنے والی کلیوں کی یہ بہاریں
جن صُبحوں اور جن شاموں کا موسم ہیں
وہ دن آئیں گے تو .....
اور کانٹوں کی ٹوٹتی نوکیں ہمارے قدموں کے نیچے کڑکڑانے لگتی ہیں
اور سانسوں کی لہر میں لوہے کی سیّال سی پتری جڑ جاتی ہے
اور زمین کی پیٹھ پہ اپنا بوجھ بہت کم رہ جاتا ہے
اب تک ہم نے کیسے کیسے یقینوں کے اِن نیلم جڑے پیالوں میں
عمروں کا زہر پیا ہے
یوں کتنے ڈربوں میں اس کے چہروں پر اک مٹیالی سی دمک جیتی ہے،
آسمانوں کی گونجتی پنہائی میں ہمارے نام کے ذرّے بکھر بکھر جاتے ہیں،
اور یہ سب کچھ، کبھی نہ مرجھانے والے پھولوں کے ڈھیر ہمارے من ہیں،
اور یہ سب کچھ، — ایسے وقت ہیں .....
جب اپنے دامن میں پیتل کی اک پنکھڑی بھی نہیں ہوتی ......

بہار کی چڑیا

اُس کا سرما سارا گذرا، دور کہیں...... اک دھوپ کے گھر میں......
سرما، جو اس کا بچپن تھا،

اب جب دن بدلے ہیں اور ہوا کی ردا سے برف کے ٹانکے ادھڑنے لگے ہیں
نئی رُتوں کی یہ بنجارن بھی دیواروں سے ٹکراتی آنکلی ہے، اپنے منگیتر کے ساتھ،
اس کمرے میں،

اُڑتی، گاتی:

"چچ چچ، چوں، چوں...... کیا بسرام ہے!
روزن..... جن میں خوشیاں پنکھ سمیٹ کے چہکیں،
آنگن..... جس میں اتنے پھول اور ریزۂ زر کا ارزن،
پل بھر تو اس طاق پہ بیٹھیں...... چوں چوں، چچ چچ....."

لیکن......کون ہے یہ اس شیش محلّے میں اُس جیسی،
کون ہے،...... پہلے سے یہ بَیرن......،

جھپٹ جھپٹ کر اُس نے اس چہرے پر کالک مل دی،
اور اب وہ اور اُس کا منگیتر دونوں، گلے پُھلا کر،
کتنے تاؤ میں، اُس بے عکس آئینے کے آگے، بیٹھے ہیں،
باغی، جو ہر دورا پنے سائے سے لڑنے آتے ہیں!

پھولوں کی پلٹن

آج تم ان گلیوں کے اکھڑے اکھڑے فرشوں پر چلتے ہو
بچو، آؤ تمہیں سنائیں، گزرے ہوئے برسوں کی کہانی جنوریوں کی باتیں

تب یہ فرش نئے تھے
صبح کو لمبے لمبے اوور کوٹ پہن کر، لوگ گلی میں ٹہلنے آتے
ان کے پراٹھوں جیسے چہرے ہماری جانب جھکتے
لیکن ہم تو آپس میں باتیں کرتے رہتے اور چلتے رہتے
پھر وہ ٹہلتے ٹہلتے ہمارے پاس آجاتے
بڑے تصنّع سے ہنستے اور کہتے
"ننھو، سردی تم کو نہیں لگتی کیا؟"

ہم سب بھرے بھرے جزدان سنبھالے
لوجس ہاتھوں میں لٹکائے
تیز ہواؤں کی ٹھنڈک اپنی آنکھوں میں بھر کر
بنا بٹن کے گریبانوں کے پلّو، اُدھڑے ہوئے کاجوں میں اُڑس کر
چلتے چلتے تن کے، کہتے
"نہیں تو! کیسی سردی! ہم کو تو نہیں لگتی!"

بچّو، ہم اِن اینٹوں کے ہسم عمر ہیں جن پر تم چلتے ہو
صبح کی ٹھنڈی دھوپ میں بہتی آج تمہاری اک اک صف کی وردی
ایک نئی تقدیر کا پہناوا ہے!
اُجلے اُجلے پھولوں کی پلٹن میں چلنے والو
تمہیں خبر ہے، اس فٹ پاتھ سے تم کو دیکھنے والے،
اب وہ لوگ ہیں، جن کا بچپن،
اُن خوابوں میں گزرا تھا، جو آج تمہاری زندگیاں ہیں!

○

جو ہو سکے تو مرے دل، اب اک وہ قصہ بھی
ذرا سنا کہ ہے کچھ ذکر جس میں تیرا بھی
کبھی سفر ہی سفر میں، جو عمرِ رفتہ کی سمت
پلٹ کے دیکھا تو اڑتی تھی گردِ فردا بھی
مرے وجود میں ہیں جتنے موسم، ان کو بھی
رُتوں کے رس میں بجھے سالو، تم نے دیکھا بھی
بڑے سلیقے سے، دنیا نے میرے دل کو دیئے
وہ گھاؤ جن میں تھا سچائیوں کا چرکا بھی
کسی کی روح سے تھا ربط، اور اپنے حصے تھی
دبے کلی، جو ہے موجِ زماں کا حصہ بھی
یہ آنکھیں، ہنستی وفائیں، یہ پلکیں، جھکتے خلوص
کچھ اس سے بڑھ کے کسی نے کسی کو سمجھا بھی
یہ رسم، حاصلِ دنیا ہے، اک یہ رسمِ سلوک
ہزار اس میں سہی نفرتوں کا ایسا بھی
دلوں کی آنچ سے تھا برف کی سلوں پہ کبھی
سیاہ سانسوں میں لتھڑا ہوا پسینہ بھی
مجھے ڈھکی چھپی، ان بوجھی الجھنوں سے ملا
جچی تُلی ہوئی اک سانس کا بھروسہ بھی
کبھی کبھی انہی الہڑ ہواؤں میں مجسّد
سنا ہے دور کے اک دیس کا سندیسہ بھی

برہنہ

فرنگی جریدوں کے اوراقِ رنگیں
یہ ہنستی، لچکتی، دھڑکتی لکیریں
کسیلے بدن تیغ کی دھار جیسے
لہو رس میں گوندھے ہوئے جسم ریشم کے انبار جیسے

نگہ جن پہ پھسلے، وہ شانے وہ باہیں
مدوّر اٹھانیں، منوّر ڈھلانیں
ہر اک نقش میں زیست کی تازگی ہے
ہر اک رنگ سے کھولتی آرزوؤں کی آنچ آ رہی ہے

خطوطِ برہنہ کے ان آئینوں میں
حسیں پیکروں کے یہ شفاف خاکے
کہ جن کے سجل روپ میں کھیلتی ہیں
وہ خوشیاں، جو صدیوں سے بوجھل کے اوجھل رہی ہیں!

خون چھلکے گا، ہم نہیں ہونگے
ہم نہیں ہوں گے، لیکن اے مرے دیس
ایک دن آئے گا، خدا نہ کرے
کبھی وہ دن بھی آئے جب ترے برج
قدر انداز دشمنوں سے بھرے

تیری گلیوں پہ آگ انڈیلیں گے
تیری گلیاں کہ جن سایوں میں کل
لڑکھڑاتے مقدّروں کے پرے
ٹوٹتی سیڑھیوں سے اتریں گے
وقت کی موج سے اُبھرتی ہوئی
قوم کی وردیاں پہن لیں گے

ہم بھی اے کاش دیکھ سکتے انہیں
کون ہوں گے وہ لوگ جن کے بدن
خود ہمارے لہو کی دیواریں
جن کے سینے میں سنسناتے الاؤ
خود انہیں کے شعور کی لپٹیں

یوں تو کس کو خبر ہے، کل کیا ہو
پھر بھی اے شہرِ خوش قبا، تیرے
دوش پر ہے جس آفتاب کی ڈھال
جب یہ سورج بدستِ فردا ہو
جب قدم ظلمتوں کا پسپا ہو

یاد رکھنا کہ یہ رُتیں فصلیں
یہ بہاریں جو آگ کی رو سے
زندگی کے گلاب کا رس لیں
رو گئی ہیں انہیں، کسے معلوم
کتنی بے عزم، زرد رو، نسلیں

یہی بے عزم، زرد رو، پیکر
چند خوشیوں کا سوگ، جن کے جتن
چند خوابوں کی گرد، جن کے نگر
یہی ہم، جن کی ہر تڑپ سے ہے آج
سو شکن دشمنوں کے ماتھے پر

فتح اس آتشیں شکن کی شکست
جو ترے دشمنوں کے ہاتھوں پہ ہے
کتنی ان مٹ ہے، کون جانتا ہے
یہی ریکھا، جو تیرے ہاتھوں پہ ہے

(جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء سے پہلے لکھی گئی)

○

کبھی تو سوچ ترے سامنے نہیں گزرے
وہ سب سمے جو ترے دھیان سے نہیں گزرے

یہ اور بات کہ آہوں کے درمیاں میں بھی
یہ واقعے، کسی تقریب سے نہیں گزرے

اِن آئینوں میں جلے ہیں ہزار عکسِ عدم
دوامِ درد! ترے رتجگے نہیں گزرے

سپردگی میں بھی اِک رمزِ خود نگہداری
وہ میرے دل سے مرے واسطے نہیں گزرے

بکھرتی لہروں کے ساتھ، ان دنوں کے تنکے بھی تھے
جو دل میں بہتے ہوئے رک گئے، نہیں گزرے

انہیں حقیقتِ دریا کی کیا خبر امجدؔ
جو اپنی روح کی منجدھار سے نہیں گزرے

صدا بھی، مرگِ صدا

نہ کوئی سقفِ منقش، نہ کوئی چترِ حریر
نہ کوئی چادرِ گل اور نہ کوئی سایۂ تاک
بس اک تودۂ خاک!

بس ایک ٹھیکریوں سے ڈھکی ہوئی ڈھلوان
بس ایک اندھے گڑھے میں ہجومِ کرمکِ کور
بس ایک قبۂ گور!

نہ کوئی لوحِ مسطّر، نہ کوئی خشتِ نشاں:
یہیں یہ دفن ہے وہ صاحبِ سخن کہ جسے
نظامِ دنیا نے!

ہزار مرتبہ عرضِ نوا کی دعوت دی
مگر وہ اپنی فصیلِ خیال میں محصور
رہِ زمانہ سے دور

خروشِ برق سرِ نیستاں سے بے پروا
سکوتِ سینۂ یک چوب نَے میں ڈوب گیا
صدا ابھی، مرگِ صدا

یہیں وہ دفن ہے — وہ روح، جس کی دھیمی آگ
جو ڈھل سکی بھی کبھی تو ڈھلی بہ قالبِ حرف،
پہن کے جامۂ برف!

ضمیرِ ارض پہ کھینچی گئی لہو کی لکیر۔
اور اس کا ایک بھی چھینٹا نہیں سرِ قرطاس
بہ مصحفِ احساس!

کیا یہ ہم کو خبر ہے؟

آخر، اِک دن، دنوں کی اِک اِک سچائی کو جھوٹ کے تیشے مقرض کر دیتے ہیں
دیکھو..... سوچو.....،
دل کی اس بیچاک میں ہیں جو شکنجے، وہ تو ویسے ہی تھے
اس بیچاک سے نچڑا ہوا وہ گیہوں، جو، زیتون کا رس تو ویسا ہی تھا،
جسموں کی سب کار گہیں تو ویسی ہی تھیں
جب تب سر فرعونوں کے آگے جھکتے تھے، تب بھی
جب اِک گورا پلٹن اس سنگھاسن پر پہرہ دیتی تھی، تب بھی
اور اب بھی جب ہم نے مستقبل کا سارا بوجھ اپنے شانوں پر بانٹ لیا ہے

گورا پلٹن کی سنگینوں کے سائے میں بھی بھوجن ملتا تھا،
فرعونوں کی خدائی میں بھی بندے پیتل بھات سے بھر لیتے تھے،
اور اب، اپنے گھروں میں، ہم بھی ایک ایک منتلج آسائش رکھتے ہیں،
تو کیا صرف ہمیں سچے ہیں
کیا وہ سب جھوٹے تھے،

یوں تو آج ہم ان پہ ترس کھاتے ہیں
جن کی پشت ڈھوتی عاجزیاں فرعونوں کے چابک کھاتی تھیں۔
کیا یہ ان کو خبر تھی؟
کیا یہ ہم کو خبر ہے؟
اس سب کچھ کا حاصل تو وہ سچائی ہے، جس کو
آخر جھوٹ کے تیشے مقرّض کر دیتے ہیں!

پھر کیوں یہ سب دریا ان انگلیوں میں بہے ہیں
چہروں، کھوپڑیوں، کے دریا،
شہرِ ازل کے اونچے پل کی کھڑی ڈھلان سے لے کر
اِن گلیوں، اِن دہلیزوں تک بہتے، آتے، دریا،
دریا — جن پہ شکن ہے، چھاپ لہو کی!
لہریں — جن پہ بھنور ہیں، لہو کی مہریں!
آخر، سچ کے تٹ پر کون اُترا ہے؟
اپنی آنکھوں میں یوں کانٹے بھر کر میری جانب مت دیکھو، ..... میں سچ کہتا ہوں،
سوچو، آخر اب تک، کوئی بھی، سچ کے تٹ پر اترا ہے؟

○

قاصدِ مست گام، موجِ صبا
کوئی رمزِ خرام موجِ صبا
وادیِ برف کا کوئی سندیس
میرے اشکوں کے نام، موجِ صبا
کوئی موجِ خیال میں بہتی
منزلوں کا پیام، موجِ صبا
تیرے دامن کی خوشبوؤں میں گم
سو سہانے مقام، موجِ صبا
سو سمٹتی مسافتوں کا طلسم،
تیری کروٹ کا نام، موجِ صبا
آئی پت جھڑ کے ساتھ لوٹتے وقت
اِک بہاریں پیام، موجِ صبا
اک نویدِ نگاہِ اہلِ حبیب
اِک جوابِ سلام موجِ صبا

ریلوے اسٹیشن پر

آہنی، سبز، جنگلے کے قریب
باتوں باتوں میں ایک برگِ عقیق
تونے جب توڑ کر مسل ڈالا
مجھ کو احساس بھی نہ تھا کہ یہی
جاوداں لمحہ — شاخِ دوراں
سے کٹ کے — تا عمر میری دنیا پر
اپنی کملاہٹیں بکھیرے گا
اسی برگِ دریدہ جاں کی طرح

آج بھی — اس دہکتی پٹڑی پر
سیٹیوں کی دھواں اگلتی صدا
گھومتے، گھنگھناتے پہیوں کو
جب پیامِ رحیل دیتی ہے
روز سو سنگتیں اجڑتی ہیں!
لاکھ سنجوگ مسکراتے ہیں

آج بھی — ریلوے اسٹیشن پر
آہنی، سبز، جنگلے کے قریب
قدمِ آدم عقیق کے پودے
تھام کر، سرخ دھاریوں والے
زرد پھولوں کے موہنے گجرے
بھری دنیا کے جمگٹوں میں کھڑے
گوشت اور پوست کے وہ پیکر ہیں
اِک زمانے سے جن کی زندگیاں
لوٹ کر پھر نہ آنے والوں کی
منتظر۔ منتظر۔ چراغ بدست
وقت کے جھکڑوں سے کھیلتی ہیں
اسی برگِ دریدہ جاں کی طرح

توسیعِ شہر

بیس برس سے کھڑے تھے جو اس گاتی نہر کے دوار
جھومتے کھیتوں کی سرحد پر بانکے پہرے دار
گھنے، سہانے، چھاؤں چھڑکتے، بُور لدے چھتنار
بیس ہزار میں بک گئے سارے ہرے بھرے اشجار

جن کی سانس کا ہر جھونکا تھا ایک عجیب طلسم
قاتل تیشے چیر گئے ان ساونتوں کے جسم

گری دھڑام سے گھائل پیڑوں کی نیلی دیوار
کٹتے ہیکل، چھنتے پنجر، جھڑتے برگ و بار
سہمی دھوپ کے زرد کفن میں لاشوں کے انبار
آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گاتی نہر کے دوار

اس مقتل میں صرف اک میری سوچ لہکتی ڈال
اس پر بھی اب — کاری ضرب اِک — اے آدم کی آل

زینیا

(۱)

انگاروں کا روپ
جیٹھ ہاڑ کی دھوپ
اور اس جلتے سمے
مہکیں تیرے رنگ
رنگ رنگ کے رنگ

(۲)

پلٹے موجِ نمو
خوشبو بچ کر تو
اگتی پتے پھول
تیری جبیں پر لاکھ
بجھے دلوں کی راکھ

(۳)

روپ ہو کتنا انوپ
باس بنا کیا روپ
اس پھلواڑی میں
خوشیوں کی اک لہر
زندگیوں کا شہر

(۴)

جیا ان کا جو
امر بہاروں کو
سونپ کے دل کی باگ
دکھ کی دھوپ جلیں
اس کی بھینٹ نہ دیں

(۵)

دیکھ سکے تو دیکھ
جیون کے یہ لیکھ

لے کر اس جگ میں
سونے کا کشکول !
سب اک پل کے مول
اپنے من کی سگندھ
بیچنے آئے ہیں
کیا تو ـــــ اور کیا میں

ھدا زینیا ایک پھول جس کے کئی رنگ ہوتے ہیں۔ یہ موسم گرما میں کھلتا ہے۔ مگر اس میں خوشبو نہیں ہوتی۔

○

میری مانند، خود نگر تنہا — یہ صراحی میں پھول نرگس کا
اتنی شمعیں تھیں تیری یادوں کی — اپنا سایہ بھی اپنا سایہ نہ تھا
میرے نزدیک تیری دوری تھی — کوئی منزل تھی کوئی عالم تھا
ہائے وہ زندگی فریب آنکھیں — تو نے کیا سوچا، میں نے کیا سمجھا
صبح کی دھوپ جیسے کہ رستوں پر — منجمد بجلیوں کا اک دریا
گھنگھروؤں کی جھنک منک میں بسی — تیری آہٹ! میں کس خیال میں تھا
پھر کہیں دل کے برج پر کوئی عکس — فاصلوں کی فصیل سے اُبھرا
پھول مرجھا نہ جائیں، ہجروں میں — ماہجبیو! کوئی گیت ساحل کا
وقت کی سرحدیں سمٹ جائیں — تیری دوری سے کچھ بعید نہ تھا
عمر جلتی ہے، بخت جلووں کے! — زیست مٹتی ہے بھاگ مٹی کا
رہیں دردوں کی چوکیاں چوکس — پھول لوہے کی باڑ پر بھی کھِلا
جو خود ان کے دلوں میں تھا تہ سنگ — وہ خزانہ کسی کسی کو ملا
لاکھ قدریں تھیں زندگانی کی! — یہ محیط، اک عجیب زاویہ تھا
ہے جو یہ سر پہ گیان کی گٹھڑی — کھول کر بھی اسے کبھی دیکھا؟

روز جھکتا ہے کوئے دل کی طرف
کاخِ صد بام کا کوئی زینہ

بہار

ہر بار اسی طرح سے دنیا
سونے کی ڈلی سے ڈھالتی ہے
سرسوں کی کلی کی زرد مورت
تھاما ہے جسے نسیم ہوا نے

ہر بار ..... اسی طرح سے ..... شاخیں
کھلتی ہوئی کونپلیں اٹھائے
رستوں کے سلاخچوں سے لگ کر
کیا سوچتی ہیں، یہ کون جانے!

ہر بار اسی طرح سے، بوندیں
پھولوں بھری بدلیوں سے چھن کر
آتی ہیں مسافتوں پہ پھیلے
تانبے کے ورق کو ٹھن ٹھنانے

ہر سال اسی طرح کا موسم!
ہر بار .... یہی مہکتی دوری!
ہر صبح ...... یہی کٹھور آنسو
رونے کے کب آئیں گے زمانے

سپاہی

تم اس وقت کیا تھے
تمہارے محلوں، تمہارے گھروں میں تو سب کچھ تھا
آسائشیں بھی وسیلے بھی
اس کبریائی کی تمکنت بھی!
سبھی کچھ تمہارے تصرف میں تھا، زندگی کا ہر اک آسرا بھی
کڑے بام و در بھی
خزانے بھی، زر بھی
چمن بھی، ثمر بھی
مگر تم خود اس وقت کیا تھے
تمہاری نگاہوں میں دنیا دھوئیں کا بھنور تھی
جب اڑتی ہلاکت کے شہپر تمہارے سروں پر سے گزرے
تمہاری نگاہوں میں دنیا دھوئیں کا بھنور تھی
اگر اس مقدس زمیں پر
مرا خوں نہ بہتا
اگر دشمنوں کے گرانڈیل ٹینکوں کے نیچے
مری کڑکڑاتی ہوئی ہڈیاں خندقوں میں نہ ہوتیں
تو دوزخ کے شعلے تمہارے معطر گھروندوں کی دہلیز پر تھے!
تمہارے ہر اک بیش قیمت اثاثے کی قیمت
اسی سرخ مٹی سے ہے جس میں میرا لہو رچ گیا ہے!

مسیحا

سدا لکھیں
انگلیاں یہ
لکھتی رہیں
لکھتی رہیں

انگلیاں یہ
کاغذ پر
رکی ہوئیں
آنکھیں یہ
کاغذ پر
جمی ہوئیں!
گہری سوچ!
جذب عمیق!
آنکھوں سے
رُوح تلک
پھیلی اک
دھیان دھنک!
آنکھیں سُرخ
چُپ، خودسوز!
ڈورے سرخ
لرزاں محو!

سامنے اِک
پارۂ جاں
درد ہی درد
ٹیس، کراہ
لو، تلچھٹ
جبر تڑمے!
کوئی سبیل؟
کچھ بھی نہیں!
کوئی اُفق
کچھ بھی نہیں!
آنکھیں فکر!
آنکھیں صدق!
آنکھیں کشف!
ایک رمق!
ایک یہ طریق!
اِک وہ اصول:
وہ مشروب
وہ محلول
کچھ کیپسول!
سطرِ شفا
حرفِ بقا!

آنکھیں یہ
سدا جلیں
سدا جئیں
سکھ بانٹیں
انگلیاں یہ
سدا لکھیں
لکھتی رہیں
سطرِ شفا
حرفِ بقا
لکھتی رہیں
لکھتی رہیں
لکھتی رہیں......

دامنِ دل

سدا رہے یہ دُھلا دُھلا اور ستھرا ستھرا،
زندہ
اپنے وجود کی اصلیّت سے مُنوّر،
اِس پر میل نہ رہنے پائے،
اِس کو گُتھ دے،
اس کو توڑ مروڑ نچوڑ دے، کس دے،
اِس کو جھٹک دے،
اِس کی گیلی شکنیں چُن دے،
اِس کو سچّے سُکھ میں سُکھا۔

○

کیا کہیئے کیا حجاب حیا کا فسانہ تھا
سب کچھ بس اک نگاہِ کرم کا بہانہ تھا

دیکھا تو ہر تبسم لب والہانہ تھا
پرکھا تو ایک میلہ صنعت گرانہ تھا

دنیا امیدِ دید کی دنیا تھی دیدنی
دیوار و در اداس تھے، موسم سہانا تھا

ہائے وہ ایک شام کہ جب مست نے بہ لب
میں جگنوؤں کے دیس میں تنہا روانہ تھا

یہ کون ادھر سے گزرا، میں سمجھا حضور تھے
اک موڑ۔ اور مڑ کے جو دیکھا زمانہ تھا

اک چہرہ اس پہ لاکھ سخن تاب رنگتیں
اے جراتِ نگہ، تیری قسمت میں کیا نہ تھا

ان آنسوؤں کی رو میں نہ تھی موتیوں کی کھیپ
ناداں، سمندروں کی تہوں میں خزانہ تھا

اے غم، انیسِ دل، یہ تری دل نوازیاں
ہم کو تری خوشی کے لئے مسکرانا تھا

اک طرفہ کیفیت، نہ توجہ نہ بے رخی
میرے لئے جنونِ دید کو یوں آزمانا تھا

ہائے وہ دھڑکنوں سے بھری ساعتیں مجید
میں ان کو دیکھتا تھا، کوئی دیکھتا نہ تھا

افسانے

پھر کلی بن کے کوئی ناچتی آہٹ نہ کھلی
پھر کوئی بنسی نہ بجی،
ریگ زاروں کے تپکتے سے چمکتے سے نشیب
منزلِ لیلےٰ کے قریب
قصرِ پرویز کی دہلیز پہ روندی ہوئی سِل
دل کسی فرہاد کا دل
اک بھنور، ایک گھڑا، ایک خیالِ محبوب
سوہنی دکھی رُوحوں کا غروب
برف انبار دیاروں کے کسی پھول کا دھیان
پر جلی تتلی کا اڑان
ہاں، یہ سب جلبسی روایات ہیں اگنی بھرے خواب!
دشتِ حقیقت کے سراب
ہاں، یہ سب کچھ فقط آرائشِ افسانہ سہی،
صورتِ دنیا نہ سہی

سچ تو یہ ہے کہ یہ سب آندھیاں چلتی بھی رہیں
مشعلیں جلتی بھی رہیں!
کاش میں بھی ترے سوچوں بھرے نینوں میں جلوں
ایک فسانے میں ڈھلوں

دل پتھر کا

اس پتھر پر اک پل کی گھائل آنچ بھی گھاؤ
اس پنکھڑی کو بہا نہ سکا طوفانوں کا بھی بہاؤ
دل پتھر کا —— پتھر پنکھڑی پھول کی

دل کیا جانے کہاں گیا ہے وہ بے انت سمے کا پڑاؤ
جہاں پہ چل کر راکھ ہوئے ہیں زندگیوں کے الاؤ
دل جو سنے تو جب کڑے ہوئے سناٹوں کی یہ کراہ
اک سندیس ہے: "جینے والو! ہم کو یاد نہ آؤ"

دل کو یاد کریں وہ سمے، دل بھول چکا وہ سبھاؤ
رات کی میلی کروٹ، آخری سانسوں کا ٹھہراؤ
کسی امرارمان کی ہچکی، کسی صدا کے شبد!
کہیں سے ڈھونڈ ان شبدوں کو اے بے مہر ہواؤ
کبھی کھلے پتھر پر —— پنکھڑی پھول کی!

دکھیاں اکھیاں

جھُکی جھُکی گھنگھور گھٹائیں
ساون، پھُوار، ہوا، ہریاول
رس کی نیند میں جاگتی دُنیا
سب کچھ، گھنی گھنی سچائی،

کچھ تو بولو —— تم کیوں ہنس دیں
پتھر کے چہرے پہ جڑی اکھیو،

دل کہتا ہے، اب کیا ہوگا،
ندی ٹیلوں تک لپکے گی،
بہنے والے بہتے بہتے،
اپنی ہونی میں ڈوبیں گے

کچھ تو بولو —— تم کیوں ہنس دیں
مجھ پہ ترس کھانے والی اکھیو

تم جانو، یہ جھونکے کس کے
عندیے ہیں! — اور یہ کن کن
تقدیروں کی برکھا میرے
ڈرے ہوئے جی میں اُتری ہے!

کچھ تو بولو ——— تم کیوں ہنس دیں
اپنے بھرم پہ لجاتی ہوئی اکھیو

یہ سبز پیڑوں کے سائے

سپہ سنگ، تپتی سڑک پر، یہ سبز پیڑوں کے سائے،
ہوا اس جگہ کتنی ٹھنڈی ہے، جھونکوں پہ سایوں کے دھبّے بھی ہیں کتنے ٹھنڈے
درختوں کے اس جھنڈ سے جب میں گزرا،
خنک چھاؤں کی ٹکڑیاں سی مرے جسم پہ تھرتھرائیں،
مرے جسم سے گر کے ٹوٹیں،
عجب اک اچھوتی سی ٹھنڈک مری روح میں سرسرائی،
سہانے دنوں کی انوکھی سی ٹھنڈک
وہ دن کتنے اچھے تھے، جب ایک بھیگی ہوئی سانس کی ریشمی رو
مرے دل کی چنگاریوں کے پسینے سے مس تھی!
وہ مبہم سی خوشیاں، جو چھپ چھپ کے، ہر موڑ پر،
نت نئے بھیس میں،
آ کے روحوں سے ملتی ہیں، مل کر بچھڑتی ہیں، جیسے
ہواؤں پہ سایوں کے چھدرے سے دھبّے،

فضاؤں میں صد ہا سفید و سیہ آفتابوں کے بکھرے سے ریزے،
سرِ خاک، بے ربط، بے سطر، خاکے،
یہ سب کچھ، بس اک دو قدم تک،
پھر آگے وہی دھوپ، شاداب ذرّوں کی جانب ہمکتی ہوئی،
سنگریزوں پہ بہتی ہوئی، — دھوپ
حدِّ عدم تک!

○

جاوداں قدروں کی گتھی اور الجھی۔ جل اٹھی تقدیرِ دل
اب تو اس مٹی کے ہر ذی روح ذرے میں بھی ہے تصویرِ دل
اپنے دل کی راکھ چن کر، کاش ان لمحوں کی بہتی آگ میں
میں بھی اِک سیال شعلے کے ورق پر لکھ سکوں تفسیرِ دل
میں نہ سمجھا، ورنہ ہنگاموں بھری دنیا میں اک آہٹ کے سنگ
کوئی تو تھا، آج جس کا قہقہہ دل میں ہے دامن گیرِ دل
رُت بدلتے ہی چمن جُو ہم صفیر، اکّے بھی، کوسوں دور سے
آ کے جب اس شاخ پر چہکے، مرے دل میں بجی زنجیرِ دل
کیا سفر تھا۔ بے صدا صدیوں کے پار، اس ہمہاتے موڑ تک
پے بہ پے ابھرا، سنہری گرد سے اِک نالۂ دلگیرِ دل
وار دنیا نے کئے مجھ پر، تو، الحمد میں نے اس گھمسان میں
اپنا سینہ چیر کر، رکھ دی نیامِ حرف میں شمشیرِ دل

بے نشاں

میں اب آیا ہوں، اتنے برسوں کے بعد
آندھیاں آئیں ، بدلیاں برسیں
دب گئیں خاک کی تہیں، تہِ خاک!
بہتی مٹّی میں بہہ گئی مٹّی......!
میرے نادیدہ پیش رو! تری قبر
کس جگہ تھی، یہ اب کسے معلوم!
یونہی، اپنے قیاس سے، میں نے
ریت کی اِک شکن کو پہچانا.....
مٹتی سطحوں پہ ایک ڈوبتی سطر!
اِک خطِ خاک! جس پہ کچھ کنکر
میں نے پہلے تو چُن کے رکھ بھی دیئے
پھر خیال آیا! اب یہ کون کہے
قبر تیری یہیں کہیں تھی، مگر
تھی کہاں، شاید اس جگہ تو نہ تھی!
کچھ جو سوچا، نجانے کیا سوچا
ذہن میں لاکھ اُلجھ گئے خاکے!
میں نے کنکر وہ سب بکھیر دیئے!

بے نشاں خاک میرے سامنے اب
اِن جہانوں کا ایک حصہ ہے
جن کے بھیدوں کی تھاہ ہیں، تو ہے
جن کے سالوں کی قبریں، ہیں ہے

ایک شبیہہ

کچھ دنوں سے، قریب دل ہے وہ دن
جب۔ اچانک اسی جگہ ۔ اک شکل
میری آنکھوں میں مسکرائی تھی،

ایک پل کے لئے تو، ۔ ایک وہ شکل
جانے کیا کچھ تھی۔ جھوٹ بھی!۔ سچ بھی
شاید اک بھول! ۔ شاید اک پہچان

کچھ دنوں سے، جان بوجھ کے، اب
یہ سمجھنے لگا ہوں، میں ہی تو ہوں
جس کی خاطر یہ عکس اُبھرا تھا!
کچھ دنوں سے تو، اب میں، دانستہ
اس گماں کا فریب کھاتا ہوں

روز اک شکل، اس دوراہے پر،
اب مرا انتظار کرتی ہے!
ایک دیوار سے لگی، ہر صبح،
ٹکٹکی باندھے، — نیم رُخ۔ یکسُو
اب مرا انتظار کرتی ہے!
میں گذرتا ہوں — مجھ کو دیکھتی ہے!
میں نہیں دیکھتا — وہ دیکھتی ہے!
اس کے چہرے کی ساخت، ساعت دید!
زرد ہونٹوں کی پتریاں، پیتل!
سرخ آنکھوں کی ٹکڑیاں، قرمز!
روغنی دھوپ میں دھنسے ہوئے پاؤں
منتظر منتظر — اداس اداس

اک یہی چہرہ، ایک پل کے لئے
جانے کیا کچھ تھا لیکن اب تو مجھے
اپنی یہ بھول، بھولتی ہی نہیں!
ایک دن یہ شبیہہ دیکھی تھی،
کچھ دنوں سے قریب دل ہے وہ دن
کچھ دنوں سے تو، بیتتے ہوئے دن
اسی اک دن میں ڈھلتے جاتے ہیں
دن گذرتے ہیں اب تو یوں جیسے!
عمر اسی دن کا ایک حصّہ ہے!
عمر گذری — یہ دن نہیں گذرا
جس طرف جاؤں — جس طرف دیکھوں
مجھ سے اوجھل بھی — مرے سامنے بھی
شکل اک — ٹین کے ورق پہ وہی!
شکل اک — دل کے چوکھٹے میں وہی

دوام

کڑکتے زلزلے اُمڈے، فلک کی چھت گری، جلتے نگر ڈولے
قیامت آ گئی، سورج کی کالی ڈھال سے ٹکرا گئی دنیا
کہیں بجھتے ستاروں، راکھ ہوتی کائناتوں کے
رُکے انبوہ میں، کروڑ دو سالوں کی
کہیں اس کھولتے لاوے میں بل کھاتے جہانوں کے
سیہ پشتے کے اوجھل، ادھ کھلی کھڑکی
کوئی دم توڑتی صدیوں کے گرتے چوکھٹے سے جھانکتا چہرہ
زمینوں، آسمانوں کی دہکتی گرد میں لتھڑے
خنک ہونٹوں سے یوں پیوست ہے اب بھی
ابھی جیسے سحر بستی پہ جلتی دھوپ کی مایا انڈیلے گی
گلی جاگے گی، آنگن ہمہمائیں گے
کوئی نیندوں لدی پلکوں کے سنگ اٹھ کر
کہے گا، — رات کتنی تیز تھی آندھی

دیکھ، اے دل

دیکھ اے دل، کیا سماں ہے، کیا بہاریں شام ہے
وقت کی جھولی میں جتنے پھول ہیں انمول ہیں
نہر کی پٹڑی کے دورویہ، مسلسل، دور تک
برگدوں پر، پنچھیوں کے غل مچاتے غول ہیں

دیکھ اے دل، کتنے ارمانوں کا رس برسا گئیں
بدلیاں، جب ان پہ چھینٹے نور کے چھن کر پڑے
کتنی کومل کامناؤں کی کہانی کہہ گئے!
پیپلوں کے پیلے پیلے پات پتھ پتھ پر پڑے

دیکھ اے دل، اس رسیلی رت کے کتنے روپ ہیں
جھومتے جھونکے ہیں، جھکتی جھاڑیوں کے جھنڈ ہیں
ہائے ان پھیلی ہوئی پھلواڑیوں کے درمیاں
یہ تپتی ہوئی تنہائیاں ۔ اور ایک میں

○

برس گیا بہ خراباتِ آرزو، ترا غم
قدح قدح تری یادیں، سبو سبو ترا غم
ترے خیال کے پہلو سے اٹھ کے جب دیکھا
مہک رہا تھا زمانے میں چار سو ترا غم
غبارِ رنگ میں رس ڈھونڈھتی کرن، تری دھن
گرفتِ سنگ میں بل کھاتی آبِ جو، ترا غم
ندی پہ چاند کا پرتو، ترا نشانِ قدم
خطِ سحر پہ اندھیروں کا رقص، تو، ترا غم
نخیلِ زیست کی چھاؤں میں نے بہ کب، تری یاد
فصیلِ دل کے کلس پر ستارہ جو، ترا غم
طلوعِ مہر، شگفتِ سحر، سیاہیِ شب
تری طلب، تجھے پانے کی آرزو، ترا غم
نگہ اٹھی، تو زمانے کے سامنے ترا روپ
پلک جھکی، تو مرے دل کے روبرو، ترا غم

بارکش

چیختے پہیے، پتھ پتھریلا، چلتے بجتے سُم!
تپتے لہو کی رو سے بندھی ہوئی اک لوہے کی چٹان
بوجھ کھینچتے، چابک کھاتے جنور! ترا یہ جستن
کالی کھال کے نیچے، گرم گٹھیلے ماس کا مان

لیکن ابلتی آنکھیں، آگ بھری، پُر آب!
سارا بوجھ اور سارا کشٹ، ان آنکھوں کی تقدیر
لاکھوں گیانی من میں ڈوب کے ڈھونڈیں جگ کے بھید
کوئی تری آنکھوں سے بھی دیکھے دنیا کی تصویر

موانست

رات اچانک پھاٹک کا اک پہیہ رینگا
پگڈنڈی پر اک آہٹ نے ٹھوکر کھائی

کالے گوس پروں کو اوڑھ کے سونے والی وحشت
پاس کے پیڑ پہ، کندے جھٹک کر چونکی، چیخی
جیسے کوئی اُس کی طرف جھپٹا ہو
ڈرتے ڈرتے اس نے نیچے اندھیارے میں جھانکا

"او - یہ تو ایک وہی سایہ ہے
جو روشنیوں کے پہلے پھیرے سے بھی پہلے
روز ادھر سے گزرتا ہے اور پہلی پینگ کے پڑنے سے بھی پہلے
چلتا چلتا اس بار ہی میں کھو جاتا ہے ....
آج تو جانے کس لرزاں دھبے سے ٹکرایا وہ ...... پگلا!"

کوئل نے یہ سوچا - پھر بے کھٹکے
پتوں کی اس سیج پہ تھوڑی دیر کو اونگھ گئی وہ
بوئے سحر کے مست بلاوے پر بے ساختہ کوک اٹھنے سے پہلے،

ثمرِ خوں

یہ قصّہ حاصلِ جاں ہے، اسی میں رنگ بھریں
لہو کی لہر کے لہجے میں، اپنی بات کہیں،
دھوئیں میں آگ کے شیشے ہیں، زخم ہیں۔ اب ہم
انہی کڑکتے دھماکوں سے اپنے گیت چنیں!
ہمارے جیتے گھروندے، ہمارے جلتے جتن
یہ مورچے — یہ جیالے سپاہیوں کی صفیں
جلی زمین، سیہ ڈھول، صدقِ خوں کی مہک
قدم قدم پہ یہاں — مہرومہ کی سجدہ گہیں
یہ دن بھی کتنے مقدّس ہیں، بے بہا ہیں، کہ آج
ہمارا حصہ بھی ہے طالعِ شہیداں میں
اسی تڑختی ہوئی باڑھ میں، ہمیں کو ملیں
سنورتی، سجتی، نکھرتی، دلوں کی اقلیمیں
یہ جینے والوں نے دیکھا کہ اس گروہ میں تھے
وہ جاں نثار — کہ جو موت کو بھی فتح کریں
میں ان کو طاقِ ابد سے اتار لایا ہوں
یہ شمعیں، جن کی لوئیں میرے آنسوؤں میں جلیں

○

جب اِک چراغِ راہ گزر کی کرن پڑے
ہونٹوں کی لَو لطیف حجابوں سے چھن پڑے
یہ کِس حسیں دیار کی ٹھنڈی ہوا چلی!
ہر موجۂ خیال پہ صد ہا شکن پڑے
اک پل بھی کُنجِ دل میں نہ ٹھہرا وہ رہ نورد
اب جس کے نقشِ پا ہیں چمن در چمن پڑے
اِک جست اس طرف بھی، غزالِ زمانہ رقص
رہ تیری دیکھتے ہیں خطا و ختن پڑے
جب انجمن تموّجِ صد گفتگو میں ہو
میری طرف بھی اِک نگۂ کم سخن پڑے
صحرائے زندگی میں جدھر بھی قدم اٹھیں
رستے میں ایک آرزوؤں کا چمن پڑے
اس جلتی دھوپ میں یہ گھنے سایہ دار پیڑ
میں اپنی زندگی انہیں دے دوں جو بن پڑے
امجد طریقِ مے میں ہے یہ احتیاط شرط
اک داغ بھی کہیں نہ سرِ پیرہن پڑے

ایک شام

دیکھ، پھر آج بھی اس نگری میں
شام کی کرنیں، تیرے ساتھ چلی ہیں
تیرے ساتھ چلی ہیں

دیکھ اب کہیں کہیں ان لمبی، لال لووں کی لڑیاں میلی دھوپ میں بجھ کے
رستوں سے پیوست پڑی ہیں
کہیں کہیں یہ زرد، سلگتے، تیکھے، بان دلوں میں چبھ کر ٹوٹ گئے ہیں!

آسمان سے لے کر سطح زمیں تک
ہر سُو، پھیل گئی ہیں لاکھ خراشیں
دکھتی خراشیں، گہری، الجھی ہوئی، لہریلی!
پگھلی ہوئی، بے جسم، سلاخیں، پتلی پتلی، پیلی پیلی

دیکھ، ان سیّال سلاخوں کی چمکیلی باڑھ پہ جتنے پھول تھے، ان کو،
توڑ کے لے گئے بے سُدھ جھونکے
باقی صرف اک سرد سیاہ الجھاؤ

بجھتی ہوئی اک سانس کے قیدی!
دیکھ، اب تیرے سامنے ہیں وہ سارے سرد سیاہ زمانے،
جن کے بھنور میں تیرے دیپ کی لو اس وقت سے لرزاں ہے،
پہلا سورج، صدیوں پہلے، جب ترے دل میں ڈوبا تھا!

نیلم جڑے پیالوں میں

اور ..... ان خارزاروں میں چلتے چلتے خیال آتا ہے
سدا ہمارے دلوں میں چٹکنے والی کلیوں کی یہ بہاریں
جن صُبحوں اور جن شاموں کا موسم ہیں
وہ دن آئیں گے تو .....''
اور کانٹوں کی ٹوٹتی نوکیں ہمارے قدموں کے نیچے کڑکڑانے لگتی ہیں
اور سانسوں کی لہر میں لوہے کی سیّال سی پتری جڑ جاتی ہے
اور زمین کی پیٹھ پہ اپنا بوجھ بہت کم رہ جاتا ہے
اب تک ہم نے کیسے کیسے یقینوں کے اِن نیلم جڑے پیالوں میں
عمروں کا زہر پیا ہے
یوں کتنے ڈربوں میں اس کے چہروں پر اِک مٹیالی سی دمک جیتی ہے،
آسمانوں کی گونجتی پنہائی میں ہمارے نام کے ذرّے بکھر بکھر جاتے ہیں،
اور یہ سب کچھ، کبھی نہ مرجھانے والے پھولوں کے ڈھیر ہمارے من ہیں،
اور یہ سب کچھ، — ایسے وقت میں .....
جب اپنے دامن میں پیتل کی اِک پنکھڑی بھی نہیں ہوتی ......

بہار کی چڑیا

اُس کا سرما سارا گذرا، دور کہیں...... اک دھوپ کے گھر میں......
سرما، جو اس کا بچپن تھا،

اب جب دن بدلے ہیں اور ہوا کی ردا سے برف کے ٹانکے ادھڑنے لگے ہیں
نئی رُتوں کی یہ بنجارن بھی دیواروں سے ٹکراتی آنکلی ہے، اپنے منگیتر کے ساتھ،
اس کمرے میں،

اُڑتی، گاتی:

"بچ بچ، چوُں چوُں...... کیا بسرام ہے!
روزن...... جن میں خوشیاں پنکھ سمیٹ کے چہکیں،
آنگن...... جس میں اتنے پھول اور ریزۂ زر کا ارزن،
پل بھر تو اس طاق پہ بیٹھیں...... چوں چوں، بچ بچ......"

لیکن...... کون ہے یہ اس شیش محلکے میں اس جیسی،
کون ہے، ...... پہلے سے یہ بَیرن ......،

جھپٹ جھپٹ کر اس نے اس چہرے پر کالک مل دی،
اور اب وہ اور اس کا منگیتر دونوں، گلے پُھلا کر،
کتنے تاؤ میں، اس بے عکس آئینے کے آگے، بیٹھے ہیں،
باغی، جو ہر دور اپنے سائے سے لڑنے آتے ہیں!

پھولوں کی پلٹن

آج تم ان گلیوں کے اکھڑے اکھڑے فرشوں پر چلتے ہو
بچو، آؤ تمہیں سنائیں، گزرے ہوئے برسوں کی کہانی جنوریوں کی باتیں

تب یہ فرش نئے نئے تھے
صبح کو لمبے لمبے اوور کوٹ پہن کر، لوگ گلی میں ٹہلنے آتے
ان کے پراٹھوں جیسے چہرے ہماری جانب جھکتے
لیکن ہم تو آپس میں باتیں کرتے رہتے اور چلتے رہتے
پھر وہ ٹہلتے ٹہلتے ہمارے پاس آجاتے
بڑے تصنّع سے ہنستے اور کہتے
"ننھو، سردی تم کو نہیں لگتی کیا؟"

ہم سب بھرے بھرے جزدان سنبھالے
لوجس ہاتھوں میں لٹکائے
تیز ہواؤں کی ٹھنڈک اپنی آنکھوں میں بھر کر
بنا بٹن کے گریبانوں کے پلّو، اُدھڑے ہوئے کاجوں میں اُڑس کر
چلتے چلتے. تن کے، کہتے
"نہیں تو! کیسی سردی! ہم کو تو نہیں لگتی!"

بچّو، ہم اِن اینٹوں کے ہم عمر ہیں جن پر تم چلتے ہو
صبح کی ٹھنڈی دھوپ میں بہتی آج تمہاری اک اک صف کی وردی
ایک نئی تقدیر کا پہناوا ہے!
اُجلے اُجلے پھولوں کی پلٹن میں چلنے والو
تمہیں خبر ہے، اس فٹ پاتھ سے تم کو دیکھنے والے،
اب وہ لوگ ہیں، جن کا بچپن،
اُن خوابوں میں گزرا تھا، جو آج تمہاری زندگیاں ہیں!

○

جو ہو سکے تو مرے دل، اب اک وہ قصّہ بھی
ذرا سنا کہ ہے کچھ ذکر جس میں تیرا بھی
کبھی سفر ہی سفر ہیں، جو عمرِ رفتہ کی سمت
پلٹ کے دیکھا تو اڑتی تھی گردِ فردا بھی
مرے وجود میں ہیں جتنے موسم، ان کو کبھی
رُتوں کے رس میں بجھے سا لو، تم نے دیکھا بھی
بڑے سلیقے سے، دنیا نے میرے دل کو دیئے
وہ گھاؤ جن میں تھا سچا ئیوں کا چرکا بھی
کسی کی روح سے تھا ربط، اور اپنے حصے تھی
دبے کلی، جو ہے موجِ زماں کا حصّہ بھی
یہ آنکھیں، ہنستی دفائیں، یہ پلکیں، جھکتے خلوص
کچھ اس سے بڑھ کے کسی نے کسی کو سمجھا بھی
یہ رسم، حاصلِ دنیا ہے، اک یہ رسمِ سلوک
ہزار اس میں سہی نفرتوں کا ایما بھی
دلوں کی آنچ سے تھا برف کی سلوں پہ کبھی
سیاہ سانسوں میں لتھڑا ہوا پسینہ بھی
مجھے ڈھکی چھپی، ان بوجھی الجھنوں سے ملا
جچی تُلی ہوئی اک سانس کا بھروسہ بھی
کبھی کبھی انہی الہڑ ہواؤں میں محبت
سنا ہے دور کے اک دیس کا سندیسہ بھی

برہنہ

فرنگی جریدوں کے اوراقِ رنگیں
یہ ہنستی، لچکتی، دھڑکتی لکیریں
کسیلے بدن تیغ کی دھار جیسے
لہو رس میں گوندھے ہوتے جسم، ریشم کے انبار جیسے

نگہ جن پہ پھسلے، وہ شانے وہ باہیں
مدوّر اٹھانیں، منوّر ڈھلانیں
ہر اک نقش میں زیست کی تازگی ہے
ہر اک رنگ سے کھولتی آرزوں کی آنچ آ رہی ہے

خطوطِ برہنہ کے ان آئینوں میں
حسیں پیکروں کے یہ شفاف خاکے
کہ جن کے سجل روپ میں کھیلتی ہیں
وہ خوشیاں، جو صدیوں سے بوجھل کے اوجھل رہی ہیں!

انہیں پھونک دے گی یہ بے مہر دنیا
فرنگی جریدوں کے اوراقِ رنگیں
کو اک بار حسرت سے تک لو
پھر ان کو حفاظت سے، اپنے دلوں کی مقفل درازوں میں رکھ لو۔

سونے والو

صبح ہوتی ہے — صبح جو نیندوں میں جینے والی اِک موت سے جاگ
اٹھنے کی انگڑائی ہے

سونے والو، تمہاری خاک آلودہ لمبی نیندیں
میری اِک اِک شب کی نیند کی ہمشگیاں ہیں

سونے والو، جیسی تمہارے وقتوں میں تھی، اب بھی اسی طرح سے ہے یہ دنیا،
صبحیں اور ان کے بعد آنے والی شاموں کے کالے جھونکے ..... جن کے
دامن میں
موت سے، نیندوں میں اُبدائی ہوئی سی،
اور گلی کی ٹوٹی سلاخوں والی نالی تک آکر، جب اِک بوڑھے نے
اپنے کھوکھلے پوپلے سے جبڑے کو عصائے خم پر رکھ کے جنازہ برداروں
سے پوچھا:

"کون تھا؟"
تو گدرایا ہوا اک ماتمی بولا
"کوئی مہلت مند تھا، ہم تو کاندھا دینے چل پڑے اس کے ساتھ کہ وہ
سو برس جیسا تھا،"

اور اک بے آب آنسو کی سسکی جب
بھرے محلے کے دروازوں منڈیروں سے گزری ..... تو
موت کی لذّت سے سب چہرے تمتا اٹھے!

یہ سب اپنے خواب ہیں، سونے والو،
خواب ہمارے،
جن میں تمہاری دنیا جاگتی ہے، سونے والو
ہر روز ان صبحوں میں، اِک اِک شب کی موت کے ڈھلنے پر،
اِک ان دیکھے طائر کے گیت میں
مرنے والوں کے یہ بول اُبھرے!
"جیہو...... جیو جیو رے ...... جیہو...... جیو رے ....."

سونے والو، تمہیں خبر ہے،
اپنی ان نیندوں سے جاگ کے جب میں تمہارے دھیان میں جیتا ہوں، تو
تمہاری نیندوں میں کفنائے ہوئے ارماں!
مرے جینے میں جاگتے ہیں!

ھوٹل میں

بادل گرجا — گرے سنہری پردے دلوں، دریچوں پر

بند ہوئے دو گول پپوٹے، چونچ میں دب گئی گرم زباں
چھری چلی حلقوم پہ، تڑپا بیتے توے پہ تڑختا ماس
سج گئے میز پہ مے کے پیالے، بٹ گیا طشتوں میں پکوان

چھت پر، بارش، نیچے، اُجلے کالر، گدلی انتڑیاں
ہنستے مکھ، ٹکراتی قدریں، بھوگی مایا کے سب مان

باہر — ٹھنڈی رات کا گہرا کیچڑ — درد بھرے آدرش
چلو یہاں سے، — ہمیں پکارے ننگی سوچوں کا رتھ بان

○

گہرے سروں میں عرضِ نوائے حیات کر
سینے پہ ایک درد کی سِل رکھ کے بات کر

یہ دوریوں کا سیلِ رواں، برگِ نامہ بھیج
یہ فاصلوں کے بندِ گراں، کوئی بات کر

تیرا دیار، رات، مری بانسری کی لے
اس خوابِ دل نشیں کو مری کائنات کر

میرے غموں کو اپنے خیالوں میں بار دے
ان الجھنوں کو سلسلۂ واقعات کر

آ ایک دن، مرے دلِ ویراں میں بیٹھ کر
اس دشت کے سکوتِ سخن جُو سے بات کر

امجدؔ، نشاطِ زیست اسی کشمکش میں ہے
مرنے کا قصد، جینے کا عزم ایک سات کر

وطن

مرے دیس کی اِن زمینوں کے بیٹے
جہاں صرف بے برگ پتھر ہیں، صدیوں سے تنہا
جہاں صرف بے مہر موسم ہیں اور ایک دردوں کا سیلاب ہے عمر پیما

پہاڑوں کے بیٹے
چنبیلی کی نکھری ہوئی پنکھڑیاں، سنگِ خارا کے ریزے
سجل دودھیا، نرم جسم — اور کڑے، کھردرے، سانولے دل
شعاعوں، ہواؤں، زمانوں کے زخمی
چٹانوں سے گر کر، خود اپنے ہی قدموں کی مٹی میں اپنا وطن ڈھونڈتے ہیں

وطن — گرم پانی کے تسلے میں ڈھیر ان منجھے برتنوں کا
جسے زندگی کے پسینوں میں ڈوبی ہوئی محنتیں دربدر ڈھونڈتی ہیں

وطن — وہ مسافر اندھیرا
جو اونچے پہاڑوں سے گرتی ہوئی ندیوں کے کنارں، پہ شاداب شہروں میں رک کر
کسی آہنی چھت سے اٹھتا دھواں بن گیا ہے

ندی بھی زرافشاں
دھواں بھی زرافشاں
مگر پانیوں اور پسینوں کے انمول دھاروں میں جس درد کی موج ہے عمر پیما
ضمیروں کے قاتل اگر اس کو پرکھیں
تو سینوں میں کالی چٹانیں پگھل جائیں۔

جیون دیس

پیلے چہرے، ڈوبتے سورج! روحیں، گہری شامیں
زندگیوں کے صحن میں کھلتے،
قبروں کے دروازے

سانس کی آخری سلوٹ کو پہچاننے والے گیانی
ڈولتی محرابوں کے نیچے
آس بھرے اندیشے

بوڑھی، اکھڑی دیواروں کے پاؤں چاٹتی گلیاں
ٹوٹتے فرش، اکھڑتی اینٹیں،
گذرے دنوں کے ملبے!

دکھے دلوں کے سجدے چنتی پلکیں، بچھڑے پریمی
بجھے جھروکوں سے ٹکراتی
یادیں، ڈھلتے سائے!

بجتی ڈھولک، گاتی سکھیاں، نیر بہاتی خوشیاں
جاگتے ماتھے، سوچتے نیناں
آنے والے زمانے!

خونی بازاروں میں بکتی اِک اِک میلی چوڑی،
پنکھیاں جھلتی ننگی باہیں
نیندا آنند منہ پھوڑ ہے!

کنٹھا پہنے، اک متوالا بالا، ریڑھی والا،
موڑ موڑ پر جیون رُت کی
زخمی کلیاں بانٹے!
جینے کے یہ سارے جتن، انمول سمے کی مایا
سدا رہیں اِن سدا بہار دکھوں کے روپ سہانے

تو بھی رُک کر اس بھنڈار سے اپنی جھولی بھر لے
تیری تڑپ کا انت یہی ہے
اے دل! اے دیوانے۔

ایکٹرلیس کا کنٹریکٹ

مرا وجود، مری زندگی کا بھید ہے، دیکھ
یہ ایک ہونٹ کے شعلے پہ، برگِ گل سے خراش
یہ ایک جسم کے کندن میں، گدی گدی سے گداز
یہ ایک روح، بھنچے بازوؤں میں کھیلتی لہر

ذرا قریب تو آ، دیکھ تیرے سامنے ہیں
یہ سرخ رس بھرے لب، جن کی اک جھلک کے لئے
کبھی قبیلوں کے دل، جوشنوں میں دھڑکے تھے
جو تو کہے، تو یہی ہونٹ، سرخ رس بھرے ہونٹ
ترے لہو میں شگوفے کھلا بھی سکتے ہیں

قریب آ، یہ بدن، میری زندگی کا طلسم
تری نگاہ کی چنگاریوں کا پیاسا ہے
جو تو کہے، تو یہی زرم، لہریا، آنچل
یہی نقاب، مری چٹکیوں میں اٹکی ہوئی
یہی ادا مری انگڑائیوں سے مسکی ہوئی
یہ آبشار، ڈھلانوں سے گر بھی سکتی ہے
بس ایک شرط! یہ گوہر سطور دستا دیز
ذرا کوئی یہ وثیقہ رقم کرے تو سبھی
اکائیوں کے ادھر، جتنے دائرے ہوں گے
ادھر بھی اتنے ہی عکس ان برہنہ شعلوں کے

ایک فلم دیکھ کر

دھیرے دھیرے، ایک نڈھال سی لے میں، ساز بجے،
اس کے انگ انگ نے اک انگڑائی لی،
اُبھری رقص کی رو،
تڑپی گھائل سی اک لے،
لچکی اس کے بدن کی ڈھال،
اِک اک تیز نرت کے ساتھ،
اِک اِک بندھن اترا،
پلو ڈھلک ڈھلک کر
رُکے۔ گرے!

سامنے، اک
جگ مگ جسم
گرتی مڑتی، ٹوٹ ٹوٹ کے جڑتی، مرمر کی ڈھلوان!
سب کچھ، قاشیں، رگیں، خلیے، ماس، مسام
سب کچھ، ایک تھرکتے بہتے عکس کا جزو
سب کچھ، جسم کی باغی سلطنتوں کی ایک عجب دنیا
گول سڈول کرّے — انمول زمینیں — ساحل — جھرنے — دھوپ
چاندنی — مخمل — پھول

سب کچھ، رقص کے روپ میں ڈھلتا، ٹک ٹک چلتا، اک متحرک عکس!
سب کچھ، پاس بلاتے، پیاس بڑھاتے، ارمانوں کا سراب'

آج اک دوست نے پاس بلا کر، چائے پلا کر
پہلے تو کچھ دیر ادب اور شعر کی باتیں کیں
مجھ سے مری اک نظم سنی
اور پھر اس کے بعد یہ فلم، کہ جس کے سارے قرینے تھے
مجھ پر طنز مری اس بوسیدہ سی نظم پر طنز،
دونوں اتنے لبادوں میں!
باہر نکلا تو سنسان سڑک تھی، شب خزاں تھی
ٹھنڈی تیز ہوا میں ننگی شاخیں ناچ رہی تھیں!

اب یہ مسافت کیسے طے ہو، اے دل تو ہی بتا
کٹتی عمر اور گھٹتے فاصلے، پھر بھی وہی صحرا
چیت آیا، چیتاؤنی بھیجی، اپنا وچن نبھا
پت جھڑ آئی، پتّر مکھے، آجیون بیت چلا
خوشیوں کا مُکھ چوم کے دیکھا، دنیا مان بھری
دکھ وہ سجن کٹھور کہ جس کو روح کرے سجدا
اپنا پیکر، اپنا سایہ، کالے کوس کٹھن
دوری کی جب سنگت ٹوٹی، کوئی قریب نہ تھا
اپنے گرداب اپنے آپ میں گھلتی سوچ بھلی
کس کے دوست اور کیسے دشمن، سب کو دیکھ لیا
کانچ کی اک دیوار زمانہ، آمنے سامنے ہم،
نظروں سے نظروں کا بندھن، جسم سے جسم جدا
راہیں دھڑکیں، شاخیں کڑکیں، اِک اِک ٹیس اٹل
کتنی تیز چلی ہے اب کے ڈھول بھری دکھنا
دکھڑے کہتے لاکھوں مکھڑے، کس کس کی سنئیے
بولی تو اک اِک کی دیسی، بانی سب کی جدا

گہرے بھیدوں والے......!

گہرے بھیدوں والے! تیرا سحر ہی مجھ کو سمجھائے یہ اک بات
بات بھی اک یہ بات کہ اپنے پاس ہے جو کچھ، سب ہے تیری دین
اک یہ برتا بھی ہے تیری دین، کہ جس پر، ہم
اپنے آپ میں تل کر جیتے ہیں
کبھی کبھی تو اپنے آپ میں بھر جاتے ہیں، ایک ہی ٹھنڈی سانس کے ساتھ
میلے من کی بھروائی
تو نے ہم کو سونپا بھی تو اک یہ کیسا کام،
بیٹھے ہیں......،
آنکھیں روح کے بوجھ سے اُبلی پڑتی ہیں.....،
کہیں پپوٹوں میں ہے اپنے وجود کے ریزے کی اٹکاہٹ سی،
اب کیا ہو سکتا ہے، اپنے جواز کے آگے اپنی سب تردیدیں، بےبس ہیں،...
اندر ہی اندر کوئی شے تالو سے ٹکراتی ہے.....
ہم کہتے ہیں: "اب تک..... ٹھیک ہے!..... آگے، ..... دیکھیں گے!"
جانے یوں کن کن بھیدوں کی کٹھالی میں ہمیں پرکھتا ہے!
جانے یہ بھی اک کیا بھید ہے، یہ جو میری بابت تیرے
گمان کا ایک دکھاوا سا
میرے ذہن سے گزرا ہے!

ہوس

کبھی تو وہ دن بھی تھے، ...... مگر اب
نجانے دل کیوں سیاہ لہروں میں بہہ گیا ہے
کبھی تو وہ دن بھی تھے .... مگر اب
زمین محور میں، آسمان چوکھٹے میں، ہر چیز اپنی اپنی
حدوں میں محدود اپنی اپنی بقا میں باقی
شعاعوں میں کروٹیں وہی تابش گہر کی
ہواؤں میں دھاریاں وہی موجِ رنگ زر کی

کبھی تو وہ دن تھے ...... وہ دن، جب
بدن پہ بے رنگ چیتھڑے تھے،
جہت جہت میں الجھ گئی تھی،
زمین ـــــ اِک بے وجود نقطہ،
جہان ـــــ اِک رائیگاں صداقت،
حیات ـــــ اِک بے وفا حقیقت،
عجیب دن تھے، ہر ایک ذرّے کے دل میں داغِ فنا کا
سورج ابھر رہا تھا،

وہ دن، وہ احساس بے ثباتی

وہ دولتِ بے زری،

وہ اپنی نمودِ بے سود میں غمِ لازوال کو ڈھونڈھنے کی خوشیاں!

کہاں سے ڈھونڈوں وہ دن، کہ اب تو
ہوا کے ٹھنڈے غرور میں ہیں ہوس کے تیشے
ہوا کے تیشے، جو طنز ہیں، جو میری خود فراموشیوں، مری بے لباسیوں پر،
مرے بدن کو بھی اب تو درکار ہیں وہ ساماں
جو رزقِ سم ہیں، جو مرگِ دل ہیں!

○

جو دل نے کہہ دی ہے، وہ بات اَن کہی بھی نہ تھی
یہ موج تو تہہِ دریا کبھی رہی بھی نہ تھی

جھکیں جو سوچتی پلکیں، تو میری دنیا کو
ڈبو گئی وہ ندی، جو ابھی بہی بھی نہ تھی

بہک گیا کوئی سایا، سمٹ گیا کوئی دور
کسی کے عکس کی پیاسی کشش سہی بھی نہ تھی

سُنی جو بات کوئی اَن سُنی، تو یاد آیا
وہ دل، کہ جس کی کہانی کبھی کہی بھی نہ تھی

کسی کی روح تک اِک فاصلہ خیال کا تھا!
کبھی کبھی تو یہ دُوری رہی سہی بھی نہ تھی

نشے کی رَو سے جھلکا ہے کیوں نشے کا شعور
اس آگ میں تو کوئی اب آگہی بھی نہ تھی

نگر نگر وہی آنکھیں، پسِ زماں، پسِ در
مری خطا کی سزا، عمر گمرہی بھی نہ تھی

غموں کی راکھ سے امجد، وہ غم طلوع ہوتے
جنھیں نصیب اِک آہِ سحر گہی بھی نہ تھی

بھکارن

تیز قدموں کی آہٹوں سے بھری
رہگذر کے دو رویہ، سبزہ و کشت
چار سو ہنستی، رنگتوں کے بہشت
صد خیابانِ گل، کہ جن کی طرف
دیکھتا بھی نہیں کوئی راہی!

سرخ پھولوں سے اک لدی ٹہنی
آن کر بجھ گئی ہے رستے پر
کنکروں پر جبیں رگڑتی ہے
راہگیروں کے پاؤں پڑتی ہے

"میں کہاں روز روز آتی ہوں
ہے مرے کوچ کی گھڑی نزدیک
جانے والو! بس اک نگاہ کی بھیک"

اِس خود موج سمندر میں....

کہاں سفینے اس خود موج سمندر میں اُن روحوں جیسے.....
روحیں جن کے خیال سے میں جیتا ہوں!

جب دریا چڑھتا ہے اور جب اس کی کوئی سیہ سی لہر، اچانک
میرے دل کے ٹھنڈے پانیوں کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے،
تو میں، سب پتواریں چھوڑ کے، بے بس ہو کے اُتر جاتا ہوں،
ان ہوتے امروں کی منشاؤں میں
اور اس اک وقفے میں، ڈرتے ڈرتے،
جلدی سے، بھر لیتا ہوں، اپنی آنکھوں کی کشتیوں میں، ان سب
لوگوں کو،
جن کے خیال سے میں جیتا ہوں،
تب، میری پلکوں کے سایوں میں وہ روحیں، سب اک ساتھ، اکٹھی،
کتاں کتاں، اس کشش کے محور میں آجانے کا جتن کرتی ہیں،
جس کی کشش سے سب دریا چڑھتے ہیں!

کہاں سفینے اس خود موجِ سمندر میں ان روحوں جیسے
روحیں، جو میرے جی میں جیتی ہیں.....

جلسہ......

آج سحر دم میں نے بھی رک کر وہ جلسہ دیکھا،

پکی سڑک کے ساتھ، ذخیرے میں، ٹوٹی سوکھی شاخوں کے
چھدرے چھدرے سائبانوں کے نیچے
شیشم کے گنجان درختوں کے آپس میں جڑے تنے، سب اس جلسے
میں کھڑے تھے

ایک گزرے جھونکے کی جھنکار ذخیرے میں لرزاں تھی!

آس پاس کی کالی رسموں کے سب کھیت ہرے ہیں،
اور یہ پانی تمہاری باری کا تھا،
اب کے بادل دریاؤں پر جا کر برسے،
ان سے تمہارا بھی تو عہد نامہ تھا،
اب کیا ہوگا؟
چلتے آروں کے آگے چرتے گرتے جسمو، پاتالوں میں گڑ جاؤ،
ورنہ......"

اُس ہستیکھی محبت میں اتنی سچائی تھی
جیسے ان پیڑوں کے سب اک ساتھ ہلے غصّے میں،

اور میری آنکھوں میں پھیل گئے دکھ اک ایسے خیال کے، جن کی ثقافت
جانے کب سے اپنا مسکن ڈھونڈ رہی ہو!

○

رونے عالم تھا، جس کی جولاں گہہ
اس نے کل مُڑ کے مجھ سے دل مانگا
دھیان میں روز چھم چھماتا ہے ایک،
قہقہوں سے لدا ہوا تانگہ
دو طرف، بنگلے، ریشمی نیندیں
اور سڑک پر، فقیر اک ننگا
اب کے تو، بک گیا، سرِ مسجد
اِن سیہ آڑھتوں میں، اِک بانگا!
سبز پتّوں کی اِک فصیل اُبھری،
جب بھی گنجان باڑ کو پھاندا
وقت کے گھاٹ پر، کسی کو تو ہو
اپنے دل میں اُترنے کا ہانگا!
پھونک کر بانسری میں آگ، اِک بار
گانے والے! سرودِ باراں گا

حرص

اوروں کی کیا کہیے، خود میرا دل بھی انگاروں کا مطبخ ہے
سدا میری آنکھوں میں اک وہ کشش دہکتی ہے، جو
سب کو اپنی جانب کھینچ کے میرے وار کی زد میں لے آتی ہے

سب کچھ میری طلب کی تشنگیوں کے دہانے پر ہے
انگاروں کے اس مطبخ میں گرنے کو ہے

گاڑھا، رلچبز لہو، اک وہ کیلوکس، جو انگاروں کا استحالہ ہے
اس میں میرے دل کی کالی قوت — میں جس کے بس میں ہوں
یہ قوت مجھ سے کہتی ہے:
"دیکھ! مرے انگارے میری تڑپ کا انگ ہیں، اب کچھ تو ان کی خاطر بھی"
اور انگارے اگلتی سانسوں کے سات اب میں
اِس دنیا کے اندر، اپنے شکار کی تلاش میں

اِک اِک روح کی گھات میں
اِک اک روح کے سامنے سوالی بن کے کھڑا ہوں
میرے دل میں انگاروں کے دندانے پیہم جڑتے اور کھلتے ہیں
باہر کسی کرم کی بناوٹ میں ہونٹ ایک انوکھا، ٹھہرا ٹھہرا، ٹیڑھا زاویہ سا ہیں،

کون مجھے اب پہچانے گا
کس طرح ہنس ہنس کر مجھ سے ملتی ہے دُنیا، بدبخت

تیری خاطر

اپنے بس میں تو بس اتنا کچھ تھا ——— اور وہ بھی سب تیری خاطر
اس دل نے اپنائی عمر بسر کرنے کی اک یہ نہج بھی ——— تیری خاطر
اپنی انا کی بھینٹ تیری خاطر تھی
نطق پہ مہریں تھیں سب، تیری خاطر
تیرہ ضمیروں سے گزرا ہوں، گلیوں کی دیوار سے لگ کر ——— تیری خاطر
نخوت کے بازار میں میرے جسم پہ ٹھنڈی ہوا کی ردا بھی ——— تیری خاطر

شام کو، جب ان دو شہروں کو ملانے والی لمبی سیدھی دُہری سڑک پر
اتنے دیوں کی دوگانہ صفیں اک ساتھ جلی ہیں
ان کی نیلی نیلی پیلی پیلی لوؤں کو اپنے جی میں اتار کے
آنکھیں میچ کے، تجھ کو یاد کیا ہے ——— تیری خاطر

لے وہ ——— میرا سر جس کے نادیدہ پنجے میں ہے
جس کی انگلیاں میری کنپٹیوں میں گڑھی ہوئی ہیں
جانے میری ہی کس کیفیت میں مجھے پٹخ دینے کو،

اب میں کیسے پلٹ کر تیری جانب دیکھوں، اب میں کیسے تجھے بتاؤں
اب بھی گرم ہے راکھ، مرے قدموں کے نیچے، میرے دل کے بجھے ہوئے سورج کی،

لمبی دھوپ کے ڈھلنے پر........

لمبی دھوپ کے ڈھلنے پر اب مدتوں کے بعد ایک دن آیا ہے،
دن جو ایسے دنوں کی یاد دلاتا ہے جو سدا ہمارے ساتھ ہیں

اس کہرے میں، اس جاڑے میں
اُمڈے ہوئے ان ریزہ ریزہ بادلوں میں وہ سب نزدیکیاں ہیں جو
میرے وجود کا طلسم رہی ہیں
ورنہ کتنے دور ہیں دکھ جو صدیوں کا حصہ ہیں
کتنی دور ہے موت جو ان سب نسبتوں پر چھائی ہے ان سب ہستیوں کا حصہ ہے!

اس لمحے تو دکھ اور موت کی ان نزدیکیوں میں بھی زیادہ قریب ہے
وہ غافل کر دینے والی بے حس زندگی
اور وہ زندہ رکھنے والی جابر غفلت
جو اس میرے وجود کا طلسم ہے!

اس ٹھنڈک میں یہ اک دھیمی دھیمی سی مانوس تمازت،
ساری بھولیں، سارے خیال اسی کی کونپلیں

میرے گھر میں آم کے پیڑ کے نیچے تو خندق ہے، اب کے کھاد اس کو کیسے ڈالیں گے
کب آئیں گے آنے والے دن اور بور اور کونپلیں!
کبھی نہ آنے والی رُتوں کے دھیان کہ جن پر آج تو نظریں جم جاتی ہیں
اور میں سوچتا بھی نہیں کیا کوئی کل بھی آئے گا
ساری ندامتیں بھول گیا ہوں!

اور وہ سب نزدیکیاں، جن کو میں نے اتنی دور سے دیکھا ہے
آج تو وہ سب میرے سامنے ہیں، اس جاڑے میں مدت کے بعد آنے والے اس کہرے میں۔

○

ان گنت امروں میں اور کیا ہے ترے دل کے لئے
ایک جیون ہارڈر سا ہے، ترے دل کے لئے

رک کے، اس دھارے میں کچھ سوچ، اک یہ اچھا سا خیال
جو ترے حق میں ہے، کیسا ہے، ترے دل کے لئے

اپنے جی میں جی، مگر اس یاد سے غافل نہ جی
جو کسی کے دل میں زندہ ہے، ترے دل کے لئے

سب ضمیروں کے ثمر ہیں، پستیاں، سچائیاں
جانے تیرے ذہن میں کیا ہے، ترے دل کے لئے

والہانہ رابطوں میں جبر کے پہلو بھی دیکھ
جو بھی دل ہے ایک پنجرا ہے، ترے دل کے لئے

تو کہ اپنے ساتھ ہے، اپنے بدن کے واسطے
کوئی تیرے ساتھ تنہا ہے، ترے دل کے لئے

تیری پلکیں جھک گئیں، امجد، دیئے جب یوں جلے
جانے کس کا ذکر چھڑکا ہے، ترے دل کے لئے

دل کا چھالا

پہلے آنکھ میں کڑوی سی اِک لہر ـــــ اور پھر اِک جرم ـــــ اور پھر، یہ سب دُکھ
سب دکھ، اس اک پاپ کی جنتا!
سارے دکھ، اس دنیا کے بھی
سارے دکھ اس وہموں اور فہموں کی اگلی دنیا کے بھی
سارے عذاب، ضمیروں کو کجلانے والے
گہری، کلنک بھری، دکھتی دکھتی رکھیائیں
جن کے الجھاووں میں عمریں بٹ جاتی ہیں
اِک ہونی کے کتنے جنموں میں اس پاپ کا اک لمبا پھیرا پڑتا ہے
اس دنیا کو دکھ سے بھر دیتا ہے
کون اب گردش کرنے والی ان کالی کرتُوں کو پہچانے گا
جن سے جڑے ہوئے دن سانسوں میں یوں چکراتے ہیں
جیسے افقوں سے آگے تک تاریکی ہو
اب تو اندر ہی اندر یہ ذلت روح کو دفنا دے گی
اچھا تھا، جب دل کا چھالا پھوٹا تھا ہم اپنے قدموں میں رک جاتے!

دل کے گاؤں میں

سب کچھ جھکی جھکی ان جھونپڑیوں والے میرے دل کے گاؤں میں ہے، جو
میری اِن پلکوں کی چھاؤں میں ہے، جب یہ پلکیں میرے دل کی جانب جھکتی ہیں

باہر لاکھوں زندگیوں کے قبیلے،
بازو جھٹک جھٹک کر کوسنے والی نفرتیں
کالے جنگل، جن کی جڑیں سب میرے سینے میں ہیں

باہر، مینہ برسا ہے
باہر چھتناروں کے دھلے دھلے پہناوے، گیلی گیلی دھرتی اور چمکیلی سڑکیں
اور اندر.... میرے کمرے میں، دیواریں مجھ سے کہتی ہیں:
آج ہمارے پاس بھی بیٹھو.....
ہم نے ہی تو دیا تمہیں یہ اِک، یہ گاؤں، کہ جو اس لمحے
تمہاری ان پلکوں کی چھاؤں میں ہے.....''

اوگنہار ولا

اپنی خوب سی اک خوبی میں اُس کے لئے اک مستی تھی
اور اپنی اُس خوبی کے لچھّن دیکھے اس نے سب دنیاؤں سے
چھپ کر
اب وہ خوبی بھولا ہوا اک خواب خوباں ہے
لوگوں کے ذہنوں میں اُس خوبی کی بابت اب اک میٹھی
نفرت ہے،
پھر بھی کون اب ایسی باتوں کے بارے میں بات کرے
سب کی زبانیں چپ ہیں، سب کے دل اس علم پہ نادم ہیں
ساری معرفتیں اب بے بس ہیں،

وہ مچھلی اِک بار اس گندے پانی میں نہائی تھی،
اور اب تو زرّیں طاق پہ اک شیشے کی صراحی میں لہراتی ہے

اب رنگیں صوفوں میں دھنسی ہوئی وہ سرخ مساموں والے
گوشت کی گٹھلی،
بڑے بڑے لوگوں کی باتوں کے مفہوموں میں،
تقدیروں کی کھسر پھسر سے بھرے ڈرائنگ روموں میں،
تیرتی اتراتی ہے
فرعونوں کی باچھوں میں مسکاتی ہے،
کیسی خوب سجی وہ خوبی اس کو راس آئی ہے

تو کس دنیا سے ٹکرانے آیا ہے
تو کس جگ کی کایا پلٹنے آیا ہے
کوڑھی، او گنہار وِلا!

○

سفر کی موج میں تھے، وقت کے غبار میں تھے
وہ لوگ جو ابھی اِس قریۂ بہار میں تھے

وہ ایک چہرے پہ بکھرے، تھکے تھکے سے خیال
میں سوچتا تو وہ غم میرے اختیار میں تھے

وہ ہونٹ جن میں تھا میٹھی سی ایک پیاس کا رس
میں جانتا تو وہ دریا مرے کنار میں تھے

مجھے خبر بھی نہ تھی اور اتفاق سے کل
میں اس طرف سے جو گزرا وہ انتظار میں تھے

میں کچھ سمجھ نہ سکا میری زندگی کے خواب
ان انکھڑیوں میں جو تیرے تھے کس شمار میں تھے

میں دیکھتا تھا وہ آئے بھی اور چلے بھی گئے
ابھی یہیں تھے ابھی گردِ روزگار میں تھے

میں دیکھتا تھا، اچانک یہ آسماں پہ کُرے
بس ایک پل کو رُکے اور پھر مدار میں تھے

ہزار بھیس میں سیّار موسموں کے سفیر
تمام عمر مری روح کے دیار میں تھے

ریڈیو پر اک قیدی.......

ریڈیو پر اک قیدی مجھ سے کہتا ہے: "میں سلامت ہوں سنتے ہو،
میں زندہ ہوں!"

بھائی، تو یہ کس سے مخاطب ہے.........
ہم کب زندہ ہیں
ہم تو اپنی اس چمکیلی زندگی کے لئے تیری مقدس زندگی کا یوں سودا کر کے
کب کے مر بھی چکے!

ہم اس قبرستان میں ہیں........،
ہم اب اپنی ان قبروں سے باہر بھی نہیں جھانکتے
ہم کیا جانیں کس طرح ان پر، باہر، تیری دکھی پکاروں کے یہ ماتمی دیئے روشن ہیں
جن کے اجالوں میں اب دنیا ان لوحوں پر ہمارے ناموں کی پہچان رہی ہے۔

"صاحب" کا فروٹ فارم

یہ ــــ دھوپ جس کا مہین آنچل
ہوا سے مس ہے
رتوں کا رس ہے
تمام چاندی، جو نرم مٹی نے پھوٹتے بُور کی چٹکتی چنبیلیوں میں انڈیل دی ہے
تمام سونا، جو پانیوں، ٹہنیوں، شگوفوں میں بہہ کے ان زرد سنگتروں سے ابل پڑا ہے
تمام دھرتی کا دھن، جو بھیدوں کے بھیس میں، دور دور سرد ڈالیوں پر بکھر گیا ہے
رتوں کا رس ہے۔ رتوں کے رس کو
گداز کر لو

سبو میں بھر لو
یہ پتیوں پر جھکے ہوئے زرد زرد شعلے، یہ شاخساروں پہ پیلے پیلے پھلوں کے گچھے
جو سبز صبحوں کی ضو میں پل کر، کڑی دوپہروں کی لو میں ڈھل کر، خنک شعاعوں کی اوس پی کر
رتوں کے امرت سے اپنے نازک وجود کے آبگینے بھر کر، حدِ نظر تک، بساطِ زر پر
لہک رہے ہیں، شراب ان کی
کشید کر لو
سبو میں بھر لو

سبو میں بھر لو، یہ مدیہ مدرا، کہ اس کی ہر بوند سال بھر سو صراحیوں میں دیے جلائے
یہی قرینہ ہے زندگی کا، اسی طرح سے لپکتے قرنوں کے اس چمن میں، نہ جانے کب سے
ہزار ہا تپتے پیلے سورج، لنڈھا رہے ہیں وہ پگھلا تانبا، وہ دھوپ جس کا مہین آنچل
دلوں سے مس ہے، وہ زہر جس میں دکھوں کا رس ہے، جو ہو سکے تو اس آگ سے بھر لو من کی چھاگل
کبھی کبھی ایک بوند اس کی کسی نوا میں دیا جائے
تو وقت کی پینگ بھول جائے۔

چہروں کی اقلیمیں

کالے بادل، تیرے خوف میں ڈوب کے میرے دریا رک جاتے ہیں
کالے بادل، تیری رو کے ساتھ اُمڈتے اندیشوں کی بابت سوچوں، یا ان چڑھتے
پانیوں کو دیکھوں
جن پر یہ میری ناؤ رواں ہے، ایسے ساحلوں کی جانب، جو
میری آنکھوں میں بسنے والے چہروں کی اقلیمیں ہیں

تیری پرچھائیں کی حقیقت سے ڈرنے میں اپنی حقیقت بھی مجھ کو پرچھائیں نظر آتی ہے
مجھ اک سائے کے یہ خدشے اور تجھ ایک حقیقت کی یہ ہیبتیں
ایک قدیمی ضابطے کی ترتیبیں ہیں، جس سے ان دنیاؤں کی نمو ہے

کالے بادل، میرے ڈر کو جانچ اور اپنے دُخانوں ہی میں بکھر کے گزر جا
اِن دریاؤں سے اپنے سایوں کا بوجھ ہٹا لے
ان دریاؤں کو بہنے دے جن میں میرے خیالوں کے یہ دھارے لہراتے ہیں
دھوپ اِن پانیوں پر کھیلے گی، تو وہ جزیرے چمکیلے چمکیں گے
جو میری آنکھوں میں بسنے والے چہروں کی اقلیمیں ہیں۔

جویا

تب میرا دل بجھ جاتا ہے
میں ہوں جگ جیون کے جوہر ڈھونڈنے والے جوہریوں کا جویا
میرا دل بجھ بجھ جاتا ہے
اس پتلے، گیلے گیلے آبی کاغذ پر
جو یوں، دور تک، اس پانی پر چپیدہ ہے
جس دن باری کا پانی لگتا ہے
اور سڑک کے ساتھ، اک گھنے ذخیرے والی کیاری
تھمے ہوئے اور جمے ہوئے پارے سے بھر جاتی ہے
جب ان سطحوں پر کرنوں کی دھول بکھر جاتی ہے
اور ہوا کا ہلکے سے ہلکا بھی جھونکا ان کو چھونے سے ڈرتا ہے
تب تو ادھر ادھر ہی میرا دل کھچتا ہے
مجھ کو بھا جاتی ہے
اچھے اچھے خیالوں کی چتریلی چادر اوڑھ کے
ان چھتناروں میں یہ بھٹکنے والی ٹھنڈک!

سب کو تج کے، میں جب اس ٹھہرے پانی پر
سایوں اور شعاعوں کی جھل مل میں کھو جاتا ہوں
سارا آسمان اسی اُجلے پانی پہ اتر کر مجھ کو دیکھ رہا ہوتا ہے
میں ہوں جگ جیون کے جوہر ڈھونڈنے والے جوہریوں کا جویا!

یہ سب دن

یہ سب دن
تنہا، نایکسو
یہ سب اُلجھاوے
کالی خوشیاں کالے غم
اے مرے دل!
رہا ہے تو اب تک
کن بھگتانوں میں!
اور اب بھی تو آگے ہے
ایک وہی گذران، دنوں کی، جس کی رو
جذبوں اور خیالوں میں چکراتی ہے
ہم جیتے ہیں، ان روحوں کو بھلانے میں
سدا جو ہم کو یاد کریں
سدا جو ہم کو اپنے مثبک غرفوں سے دیکھیں
جیسے پورب کی دیوار پہ انگوروں کی بیلوں میں
بڑھتے، رکتے، ننھے ننھے، چمکیلے نقطے
کرنوں کے ریزے
جو ہر صبح کو
ہر جھونکے کے ساتھ
ان پتوں کی درزوں میں

اے مرے دل
تیری خاطر جلتے بجھتے ہیں
کس کی خاطر؟ —— یہ اک صبح!
کس کی خاطر؟ —— آج کا یہ اک دن!
کیسا دن؟
یہاں تو ہے بس ایک ہی اندھیر دنوں کا جس کی رو
روحوں میں اور جسموں میں چکراتی ہے۔

○

سنا ہے میں نے کہ شعریؔ تمہاری سمتِ سفر
بساطِ گل پہ کبھی برف کی سلوں میں ہے
تمہارا ابتلائے شوق جاگزیں، اب کے،
کنارِ کوہ پہ پنسیلم کے ساحلوں میں ہے،
تمہیں تلاش ہے جس عالمِ مسرت کی،
وہ سبز کنجوں نہ گل پوش منزلوں میں ہے،
تمہارے بعد، مجید امجدؔ اور انجمؔ نے،
بسالیا وہ سوات اُن کے جو دلوں میں ہے،
لذیذ پانی پیا، سیب کھائے، شعر پڑھے،
اک ایسا دن کہاں دنیا کی محفلوں میں ہے،
ہماری روح کی سیف الملوک جھیل کے پاس
ہمارا تذکرہ جنت شمائلوں میں ہے،
کبھی کبھی جو ہمارے دلوں میں جھانکتا ہے،
کہاں وہ لمحہ، زمانوں کے محملوں میں ہے

نذر انجم و شعری
جھنگ مگھیانہ
۲۴/۴/۴

گوشۂ امن

میلی میلی ننگا ہوں کی اس بھیڑ کے اندر اور بھی گھس کر دیکھو.....
قاتل جبڑوں کے جُڑتے دندانوں میں شاید اِک رخنہ اُمن کا بھی ہو،
اپنے بچاؤ میں اس سے زیادہ کیسے بچے رہو گے،
پہلے ہی سے اس دیوار تک ہٹتے ہوئے ہو، جس کے آگے.....آگ ہے
ان شعلوں کے چلتے آروں کے اندر ہی کوئی رخنہ امن کا ڈھونڈو

یہ مامن تو تمہارے دلوں کے کسی گوشے میں جدا نہیں ہے
یہ مامن تو تمہاری دنیاؤں کے کسی گوشے میں جدا نہیں ہے

اندر بھی، باہر بھی، ایک ہی لشکر ہے، جس کی دو ٹکڑیاں
جنگ میں ہیں آپس میں، تمہارے دلوں کی سرحد پر، جس کے اندر کی جانب، اتنی دُور تک
تم کو پیچھے ہٹنا پڑا ہے!
اس جمگھٹ میں، اب اک بار تو ہلّہ بول کے اک وہ گوشہ امن کا اپنے واسطے ڈھونڈو
اک وہ گوشہ،
— اس جمگھٹ میں اور تمہارے دلوں میں وہ یک جا گوشہ
جس پر زندگی کے لشکر کی دو متحارب ٹکڑیوں کا مشترکہ قبضہ رہا ہے اب تک.......،

باگیں موڑ بھی لے

ٹیڑھے منہ اور کالی باتیں
کانٹے بھرے ہوئے آنکھوں میں
یہ دنیا یہ دنیا والے
تو مت جا اس اور — باگیں موڑ بھی لے

دلوں کی اس دَلدَل کے کنارے
رُوپ گھمنڈ کے پتلے سارے
اِک پر دوسرا کیچ اُچھالے
اِس تٹ پر مت ڈول — باگیں موڑ بھی لے

آگے اِس کی لہر ہے جل تھل
کسی کی بابت ماتھے پر بل
اے رے دُکھے ہوئے دل والے
یوں مت یوں مت سوچ — باگیں موڑ بھی لے

آج تو جاتے جاتے ......

آج تو جاتے جاتے اس نے مجھے اک ہامی بھرنے والے پیار سے دیکھا
بڑے اقرار سے دیکھا
اس اک آن میں، میرے گمان میں بھی یہ بات نہ تھی! یہ سب کچھ تھا امکان میں!

اس نے تو میری سانسوں کا ادھورا پن پہچان کے، سب کچھ جان کے یوں بھی
مجھے دیئے للچا دینے اپنی اک مسکان کے،
اک مسکان کہ جس میں ہارے ہوئے خود اس کے من کا سنبھالا بھی تھا
اور مجھ جیسے ترسے ہوئے پہ ترس کھانے کی کسک بھی!

جاتے جاتے اس کے من میں جانے کیا بات آئی ہو گی!
اور اس ایک نگاہ کے اندر سے جانے کس کس قوت نے یوں میری جانب جھانکا ہو گا!

اور اک میں تھا جس کے لئے ان کبھی نہ ملنے والی سب خوشیوں میں
کبھی نہ ملنے والے سب دکھ تھے!

دن کٹ رہے ہیں کشمکشِ روزگار میں
دم گھٹ رہا ہے سایۂ ابرِ بہار میں
آتی ہے اپنے جسم کے جلنے کی بو مجھے
لٹتے ہیں نکہتوں کے سبو جب بہار میں
گزرا ادھر سے جب کوئی جھونکا تو چونک کر
دل نے کہا! یہ آ گئے ہم کس دیار میں
میں ایک پل کے رنجِ فراواں میں کھو گیا
مرجھا گئے زمانے مرے انتظار میں
ہے کنجِ عافیت، مجھے پا کر پتہ چلا
کیا ہمہمے تھے گردِ سرِ رہگذار میں

دریا — پیلی آنکھوں کا

باہر، اک دریا پیلی آنکھوں کا لہراتا ہے
آنکھیں جن میں پتّوں کا پانی رِس رِس آتا ہے، ہم کو دیکھ کے،

اب ایسے میں، کِس کِس بوجھ کو سے جھٹکیں،
دل میں نیکیاں ڈہل ڈہل جائیں اور اپنے گُن ڈھارس نہ بنیں،

ہر جانب سے، ذہنوں میں اُمڈی ہوئی کالی حِرصیں،
اپنے برچھے تان کے، دھیرے دھیرے، گھات میں سرکیں،
ہم کو دیکھ کے،

اب ایسے میں، کون بتائے
کِن جتنوں سے اپنے دل میں سنبھال کے رکھی ہیں یہ اذیّت دینے والی
سب تسکینیں،

جن کے باعث،
ہم پتّوں کے پانیوں سے اِن بھری ہوئی صد ہا آنکھوں کے سامنے ڈرتے بھی ہیں،
اور اس ڈر میں جینے کا دُکھ خوشی سے سہتے بھی ہیں۔

گدلے پانی

جو بھی بہتے دریا سے اپنا چُلّو بھر لے، یہ دریا اُس کا ہے
اپنی سب پاکیزگیوں کے ساتھ اس کا ہے'
چاہے اُس پانی میں جیسے بھی جوہر ہوں'
اچھے بُرے جوہر — جو دریا کی سیّال حقیقت میں، اک ساتھ پنپ کر
بُجھ کر، تپ کر، یوں ظاہر ہیں، سب طاہر ہیں

جس کی پیاس کو اس پانی پر حق ہو،
اسے بھلا کیوں شک ہو کہ ان قطروں میں مقیّد ہیں، وہ جوہر جو جیّد ہیں،

دل میں پانی کی ٹھنڈک یہ کہتی ہے کہ طلب کا جو حاصل بھی ہے طیّب ہے'
ٹھنڈک پانے والا اسی یقین کے بل پر'
اپنے گمان میں، خوشیوں کی اس موج سے اپنی روح کے جوہر بھر لیتا ہے'
جس کی چھلک اس کی آنکھوں کے ڈوروں تک آتی ہے!

کتنے چہروں پر ہے اپنے آپ میں کافی ہونے کی اِک یہ کیفیّت'
ان قدروں کی اچھی سی اِک دین، کہ جن کے مقدّس دریا
سب گدلے ہیں!

○

بنے یہ زہر ہی وجہِ شفا جو تو چاہے
خریدلوں میں یہ نقلی دوا جو تو چاہے

یہ زرد پنکھڑیاں جن پہ حرف حرف ہوں میں
ہوائے شام میں مہکیں ذرا جو تو چاہے

تجھے تو علم ہے، کیوں میں نے اس طرح چاہا
جو تو نے یوں نہیں چاہا، تو کیا، جو تو چاہے

سلام ان پہ تہِ تیغ بھی جنہوں نے کیا
جو تیرا حکم، جو تیری رضا، جو تو چاہے

جہاں میں تیری شکم سیر روح ہے آزاد
اب اے اسیرِ کمندِ ہوا، جو تو چاہے

ذرا شکوہِ دو عالم کے گنبدوں میں لرز
پھر اس کے بعد ترا فیصلہ جو تو چاہے

جب ایک سانس گھسے، ساتھ ایک نوٹ پسے
نظامِ زر کی حسیں آسیا، جو تو چاہے

جو تیرے باغ میں مزدوریاں کریں، امجد
کھلیں وہ پھول بھی، اِک مرتبہ جو تو چاہے

ہر وقت فکرِ مرگِ غریبانہ چاہیئے
صحّت کا ایک پہلو مریضانہ چاہیئے
دنیا کے بے طریق میں جس سمت بھی چلو
رستے میں اِک سلامِ رفیقانہ چاہیئے
آنکھوں میں اُڑتے ، روح کی نزدیکیوں کے ساتھ
ایسا بھی ایک دُور کا یارانہ چاہیئے
کیا بستیوں کی ذلّتیں ، کیا عظمتوں کے فیض
اپنے لئے عذاب جداگانہ چاہیئے
اب دردِ شش بھی سانس کی کوشش میں ہے شریک
اب کیا ہو، اب تو نیند کو آجانا چاہیئے
روشن ترائیوں سے اترتی ہوا میں آج
دو چار گام لغزشِ مستانہ چاہیئے
امجد ، ان اشک بار زمانوں کے واسطے
اک ساعتِ بہار کا نذرانہ چاہیئے

مجید امجد نے اپنی ساری زندگی لاہور، کراچی اور اسلام آباد جیسے پر شور شہروں سے دور ساہیوال کے نسبتاً خاموش قریئے میں گزاری ہے - کہتے ہیں کہ اسکا تبادلہ لاہور ہو گیا تو جب تک یہ تبادلہ منسوخ نہ ہوا مجید امجد پر جان کنی کی کیفیت طاری رہی - ساہیوال میں بھی اس کا نشیمن زیادہ گنجان آباد علاقے میں نہیں تھا بلکہ وہ ایک ایسی آبادی میں رہتا، جہاں پڑوسیوں کو بھی یہ علم نہیں ہوتا ساتھ کے مکان میں کون رہتا ہے - چنانچہ جس رات مجید امجد نے اپنی روح کے پاتال میں سب سے گہرا غوطہ لگایا اور پھر واپس آنا ضروری نہ سمجھا، اس رات بھی پڑوس میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ اس کنج مقدس سے ایک زندگی افروز خوشبو ھجرت کر گئی ہے - دوست ہر وقت پہنچے اور انہوں نے مجید امجد سے یوں وفا کی کہ اسکی فکر و نظر کے آئینے اور شعرو سخن کے عد ےاور غموں اور دکھوں کی دستا ویزاں، اس کے شعری صحیفے سب کے سب یونائیٹڈ بنک کے کنج تنہائی میں پہنچا دیئے کہ بقول مجید امجد

اس اپنی مٹی میں جو کچھ امٹ ہے مٹی ہے
جو دن ان آنکھوں نے دیکھا ہے کون دیکھے گا

انور سدید

مجید امجد کی شاعری اپنے عہد کے دکھوں اور سکھوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے - عصر حاضر کے ان سبھی المیوں سے آگاہ ہے جس کی آنکھوں کے روبرو وقوع پذیر ہوتے ہیں، وہ جدید فکری رحجانات و سیاسی اور معاشرتی تغیرات سے بھی واقف ہے - لیکن ان سب کے بارے میں اس کا مخصوص رد عمل ہے - لیکن گونا گوں رویوں اور رحجانات کی نفی یا اثبات اسکی شاعری میں یوں نہیں آتے کہ انہیں شاعری کا عنوان بنا لیا گیا ہو یا انکی رپورٹنگ کر دی گئی ہو - بلکہ اس کا رد عمل اعلیٰ شعری محاسن اور معیار کے ساتھ پیش ہوتے ہیں -

جیسے کہ ہم سب جانتے ہیں - مجید امجد ایک سچ سبھاؤ والا ٹھہری ہوئی طبیعت، دھیمے لہجے اور متین آنکھوں والا انسان تھا - اس لئے اس کی شاعری میں شور و غل، منہ زوری، بلند بانگی، شکست و ریخت کی تلاش ایک لاحاصل عمل ہوگا - اس کے ہاں کائناتی ارتقا، تاریخی عمل اور گردو پیش کے تغیرات ایسی صورت میں ملتے ہیں کہ مسلسل ہے لیکن آہستہ خرام -

مجید امجد ہمارے عہد کا ایک اہم شاعر ہے - اسے اسکی عمر میں جس طور پر نظر انداز کیا گیا ہے - آنے والے دنوں میں ایسا نہیں کیا جا سکے گا - مجید امجد ہمیشہ زندہ رہنے والے فنکاروں میں سے ہے -

ذوالفقار احمد تابش